



25/21

نیا سال

نیا سن ہجری (۱۴۰۰ھ) ہمارے سروں پر جلوہ فگن ہے ـــ حضور ختمی نبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ واصحابہ وسلم کی زندگی کا وہ عظیم بالشان واقعہ جسے "ہجرت نبوی" کے عنوان سے موسوم کیا جاتا ہے اس پر ۱۳۹۹ سال بیت گئے ـــ لیکن اتنے طویل شب و روز گذرنے کے باوجود غلامانِ محمدؐ علیہ السلام کے لیے اب بھی اس میں ایک زندہ پیغام موجود ہے ـــ اور وہ یہ کہ راہِ حق کے مسافر اس زمین سے کنارہ کشی کر لیا کرتے ہیں جس کا دامن "حق" کے لیے تنگ ہو ـــ اور ایک زمین پر ہی کیا منحصر ہے مہاجر بطحاء نے اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے تو یہ بتلایا کہ والدین و اولاد، بھائی اور ازدواجی رشتے، خاندان و مال، تجارت و محلات (اس کے علاوہ بھی جو چیز) راہِ حق میں قدم اٹھانے سے روکاوٹ بنے اور اطاعتِ خداوندی و محبتِ نبوی اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ کا پتھر ثابت ہو وہ چھوڑ دینے اور توڑ دینے کے قابل ہے بصورتِ دیگر "اللہ کے امر کا انتظار کرنا چاہیے" ـــ وہ اللہ جس کا فرمان ہے کہ بارگاہِ قدس کے نافرمانوں پہ درِ ہدایت وا نہیں ہوتا ـــ!

(س ـ ع)

23.11.79

ارشاداتِ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی

۱- ایمان اصل (جڑ) اور اعمال اس کی شاخیں ہیں۔ ایمان میں شرک سے بچو، اور اعمال میں معصیت سے۔

۲- اللہ تعالیٰ کی اطاعت قلب سے ہوتی ہے، صرف قالب (بدن) سے نہیں۔

۳- عمل کے بغیر قول اور اخلاص کے بغیر عمل ناقابلِ قبول ہیں (اخلاص) یہ ہے کہ مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔

۴- اے عمل کرنے والے! اخلاص پیدا کر، ورنہ فضول مشقت ہے۔

۵- اخلاص کی علامت یہ ہے کہ تو خلقت کی تعریف یا مذمت کی طرف توجہ نہ کرے۔

۶- خالق کا مقرب وہی ہے، جو اس کی مخلوق پر شفقت کرے۔

۷- جو خلق کے ساتھ خلق میں فراخ تر ہے، وہ خالق سے نزدیک تر ہے۔

۸- مخلوق کی محبت ان کی خیر خواہی کرنا ہے۔

۹- خالق کے ساتھ ادب کا دعویٰ غلط ہے، جب تک تو اس کی مخلوق کے ساتھ ادب نہ رکھے۔

۱۰- رضائے خالق کے خواہش مند مخلوق کی اذیت پر صبر کر۔

۱۱- مصیبتوں کو چھپا، قربِ حق نصیب ہوگا۔

۱۲- میانہ روی نصف روزی ہے، اور حسنِ اخلاق نصف دین۔

۱۳- خالی تمنا (بغیر عمل کے) حماقت کا جنگل ہے، جس میں احمق مارا مارا پھرتا ہے۔

۱۴- حیات کے دروازے کو وہ جب تک کھلا ہے، غنیمت جانتے ہوئے نیکی کرلو۔ کیونکہ وہ جلدی بند کر دیا جائے گا۔

۱۵- جو شخص اپنا معلم نہیں وہ دوسروں کا معلم کیسے ہو سکتا ہے۔

۱۶- امیروں کے ساتھ عزت و غلبہ سے مل، اور غریبوں کے ساتھ انکساری اور فروتنی سے۔

۱۷- مومن جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان جوان (قوی) ہوتا ہے۔

۱۸- اہلِ غفلت کے پاس بیٹھنا ہی تیری غفلت کی علامت ہے۔

۱۹- تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے برے ہم نشین ہیں۔



۳ محرم الحرام ۹۹ھ ⁂ ۲۳ نومبر ۷۹ء

جلد ۲۵ ⁂ شمارہ ۲۱

اس شمارے میں

• رئیس الادارہ

پیرِ طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ

—— ● ——

مدیر منتظم : میاں محمد اجمل قادری

مدیر : محمد سعید الرحمٰن علوی

بدل اشتراک	سالانہ ۶۰/۰۰ روپے ، ششماہی ۳۰/۰۰ روپے سہ ماہی ۱۵/۰۰ روپے - فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

ناشر مولانا عبید اللہ انور۔ پرنٹر الٰہی بخش۔ مطبع کاسمو پرنٹرز ۵/۱۰۰ موری گیٹ لاہور

مجلسِ ذکر

(ضبط و ترتیب — ادارہ)

اتباعِ سنّت — زندگی کی معراج

پیرِ طریقت حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم

محترم حضرات — یہ ذکر و فکر جو کچھ بھی ہے محض اسلئے ہے کہ ہمیں اللہ رب العزت کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی گذارنے کا ڈھنگ آجائے۔ ہمارا مالک کس بات سے راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض، یہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا جو اللہ کے رسول اور ہمارے ہادی و مقتدا تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کی دنیا میں آمد کی وجہ بتلاتے ہوئے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ انہیں دنیا میں اسلئے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے،،

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا کہ "رسول کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت کا راز مضمر ہے" نیز یہ کہ اللہ کا محبوب بندہ بننے کے لئے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع درکار ہے تب ہی بندہ خدا کی محبت و مہربانی کا مورد بن سکتا ہے حضور علیہ السلام نے زندگی کے نشیب و فراز بتلا دیئے اور ایک ایک چیز واضح کردی، کہ نماز کس طرح پڑھی جائے، وضو کیسے کیا جائے، زکوٰۃ کی ادائیگی — کس کو دینی ہے کہاں خرچ نہیں کرنی، روزہ اور اس کے لوازمات حج کا مکمل طریقہ، خوشی اور غم کے مواقع میں کیا کرنا چاہیئے تجارت و کاروبار کا کیا ڈھنگ ہو، حکومت و سلطنت کیسے کی جائے وغیرہ ذالک،

اور اہل اللہ اسی کو زندگی کا کمال اور معراج سمجھتے ہیں،، ہمارے سطحی لوگ اہل اللہ کے لئے کرامات کو بڑا اہم سمجھتے ہیں جبکہ اہل اللہ اور اللہ والے فرماتے ہیں کہ استقامت کرامت کے مقابلہ میں اہم ہے اور اسے ہی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی دینِ حق پر استقامت اور کامل طریق سے اطاعتِ خدا و رسول ہی اصل چیز ہے،،

محترم دوستو — نیا سن ہجری آرہا ہے (اشاعت تک آچکا ہوگا) اس سال کا پہلا مہینہ محرم الحرام اپنی اہمیت کے اعتبار سے باعثِ احترام و حرمت ہے،،

بالخصوص اسکی دسویں تاریخ بڑی اہم ہے کہ اس سے دس عظیم المرتبت انبیاء علیہم السلام کے واقعات جلیلہ وابستہ ہیں،،

اسلئے میں آپ کو توجہ دلاؤنگا کہ دسویں محرم کو روزہ سے معمور کریں بلکہ حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ۹ تاریخ کو بھی ساتھ شامل کرلیں اس سے انشاء اللہ یہ عمل نورٌ علیٰ نور ہو جائیگا اس کے

اللہ رب العزت توفیق عمل نصیب فرمائے

(آمین یا الٰہ العالمین)

آیت کریمہ

کا ورد انشاء اللہ ۲۲ نومبر بعد نماز مغرب ہوگا۔ (ناظم)

خطبۂ جمعہ

ضبط و ترتیب
ڈاکٹر مناظر حسین نظر

امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ

○ جانشین شیخ التفسیر حضرۃ مولانا عبید اللہ انور مدظلہم ○

الحمد للہ و کفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ: اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:—

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ.. تا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ○

(پ۲۶ س الفتح۔ آیت ۱۸-۱۹)

ترجمہ: بے شک اللہ مسلمانوں سے راضی ہوا جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ پھر اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا پس اُس نے اُن پر اطمینان نازل کر دیا اور انہیں جلد ہی فتح دے دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی دے گا جنہیں وہ لیں گے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

بیعتِ رضوان

آقائے نامدار فداہ ابی و امی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ طیبہ میں خواب دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں امن و امان سے داخل ہوئے اور حلق و قصر کیا آپؐ نے یہ خواب صحابہؓ سے بیان فرمایا تو وہ شدتِ اشتیاق اور فرطِ شوق سے عمرہ کے لیے بے تاب ہو گئے۔ آپؐ نے اگرچہ مدت کا تعین نہیں فرمایا تھا لیکن صحابہؓ کا خیال اس طرف گیا کہ شاید اسی سال عمرہ میسّر ہوگا —— یہ صورتِ حال دیکھ کر اتفاق سے آپؐ کا قصد بھی عمرہ کا ہو گیا اور آپؐ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہؓ کو ہمراہ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ ارادہ عمرہ کا تھا اس لیے "ہدی" بھی آپ کے ساتھ تھی۔ یہ خبر مکہ پہنچی تو قریش نے جمع ہو کر اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کر لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ میں نہ آنے دیں گے حالانکہ ان کے ہاں دستور اور قاعدہ یہ تھا کہ حج اور عمرہ سے اپنے دشمن کو بھی نہ روکتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے لیے انہوں نے اس اصول اور قاعدہ کو بھی توڑ دیا۔

حضور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اونٹنی کا حدیبیہ کے مقام پر بیٹھ جانا

دوسری طرف خدا کی قدرت کا یہ کرشمہ ظاہر ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اونٹنی حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر بیٹھ گئی اور اس طرح بیٹھی کہ

اٹھنے کا نام نہ لیا ــــ چنانچہ آپؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ صادر ہوئے "حبسہا حابس الفیل" اور فرمایا خدا کی قسم، مکہ والے مجھ سے جس بات کا مطالبہ کریں گے جس سے حرمات اللہ کی تعظیم قائم رہے میں وہ بات مان لوں گا ــــ نتیجۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں قیام فرمایا اور مکہ والوں کی طرف ایک قاصد بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے بلکہ عمرہ کی غرض سے آئے ہیں اور عمرہ کرکے واپس چلے جائیں گے۔ جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وہی پیغام دے کر بھیجا اور مکہ میں مغلوب و مظلوم مسلمان مردوں اور عورتوں کو یہ بشارت پہنچائی کہ عنقریب مکہ میں اسلام غالب ہو جائے گا ــــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب یہ پیغام لے کر مکہ پہنچے تو انہیں قریش نے روک لیا۔ اس اثناء میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت آپؐ نے سب صحابہؓ سے ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر جہاد کی بیعت لی۔ اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے تمام بیعت کرنے والوں کے حق میں واضح طور پر اعلان فرما دیا لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ تحقیق اللہ راضی ہو گیا۔ بیعت کرنے والوں سے ــ پس اس بشارت خداوندی کے باعث اس بیعت کا نام بیعت رضوان پڑ گیا۔

بیعت رضوان کرنے والے تمام لوگ یقیناً جنتی ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جن حضرات نے حدیبیہ میں بیعت کی ان میں سے ایک بھی دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب بیعت کی خبر قریش تک پہنچی تو انہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس بھیج دیا۔

حاصل

یہ ہے کہ:۔

۱۔ مومنین کی مخلصانہ بیعت سے حق تعالیٰ سبحانہٗ خوش ہوتا ہے (۲) بیعت رضوان کرنے والے تمام اصحابؓ یقیناً جنتی ہیں۔ (۳) اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مبین کی اور بیعت کرنے والوں کو اطمینان و سکینہ کی بشارت ملی۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "انا فتحنا لک فتحاً مبینا" پڑھ کر صحابہؓ کو سنائی تو انہوں نے آپؐ کی خدمت میں مبارکباد عرض کی۔ اور کہا۔ یا رسول اللہ! یہ تو آپ کے لیے ہوا۔ ہمارے لیے کیا ہے؟ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ یعنی اللہ نے اطمینان و سکینہ اتار کر مومنین کا ایمان بڑھایا۔ تاکہ انہیں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ جنت میں داخل کرے اور ان کی کمزوریوں کو معاف فرما دے۔

یہاں زیر عنوان آیات میں "فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحاً قریباً" ارشاد فرما کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے فتح مبین کی خوشخبری میں صحابہؓ کو بھی شریک کر دیا ہے اور ان کے دل کے توکل، حسن نیت، صدق و اخلاص اور حبِ اسلام پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

مزید برآں یہ آیات سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت و عظمت کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کیونکہ یہ بیعت سیدنا عثمانؓ کی شہادت کی خبر سن کر ہی لی گئی تھی۔

حضرت عثمانؓ کی عظمت و فضیلت

آپ کی فضیلت و عظمت یہی کیا کم تھی کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے ڈیڑھ ہزار صحابہ کرامؓ کو سیدنا عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر جانیں لڑانے کے لیے بیعت لی اور تمام صحابہؓ کو سیدنا عثمانؓ پر اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی ٹھان لی لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اپنے کلام میں اس واقعہ کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ سیدنا عثمانؓ کی یادگار کو اَمٹ اور غیرفانی بنا دیا۔ اور اس عمل پر اپنی رضا کی مہر ثبت فرما کر بیعت کرنے والوں کو جنت کے سب سے اونچے درجے کا سرٹیفکیٹ اسی دنیا میں عطا فرما دیا۔

اللہ کا ہاتھ

سیرت کی کتابوں میں اور مختلف روایات میں اس طرح بھی بیان ہوا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی تو حضرت عثمانؓ کی طرف سے بھی بیعت لی۔ وہ اس طرح کہ اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا اور دوسرے ہاتھ پر اُس سے بیعت لی۔ گویا اپنے ایک ہاتھ کو سیدنا عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا۔ اور یہ ایسا شرف ہے جس میں کوئی دوسرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شریک و سہیم نہیں۔ چنانچہ قرآن اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے اور اس عظمت و فضیلت پر قربان ہو ہو جائیے۔

ارشادِ باری تعالیٰ

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ط يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ؕ

بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

حاشیہ شیخ الاسلامؒ

لوگ حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیعت کرتے تھے۔ اُس کو فرمایا کہ نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت کرنا ہے کیونکہ حقیقت میں نبی خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل و تاکید بیعت کے ذریعے سے کراتا ہے۔ فہذا کما قال: "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" وکما قال۔ "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی" جب بیعت نبوی کی حقیقت یہ ہوتی تو یقیناً خدا تعالیٰ کا دستِ شفقت و حمایت ان کے ہاتھوں کے اوپر ہوگا۔

بہرحال جو لوگ حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے اور پھر حضورؐ کے ہاتھ پر خود اللہ کا ہاتھ تھا۔ کلامِ الٰہی کے یہ الفاظ اس بیعت کی عظمت کو چار چاند لگا دیتے ہیں اور اس بیعت کی اہمیت کو بے مثل بنا دیتے ہیں۔

سیّدنا عثمانؓ کا دستِ مبارک

سیّدنا عثمانؓ کے ہاتھ کی جگہ حضورؐ کا اپنا ہاتھ رکھنا اور اس پر خدا کے ہاتھ کا ہونا سیدنا عثمانؓ کی عظمت شان کی ایسی زندۂ جاوید تصدیق ہے جس سے آگے تصدیق کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے معترضین کے لیے یہ لمحۂ فکریہ اور درسِ عقل و ہوش ہے انہیں چاہیے وہ سوچیں کہ وہ ہاتھ جس کے بدلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ رکھ رہے ہیں اور جس پر خود اللہ کا

ہاتھ ہے اُس کا ہاتھ ہے۔ کسی خیانت، کسی کوتاہی یا خلافِ حق عمل کا دانستہ یا نادانستہ صدور کبھی کیسے ہو سکتا ہے؟

یاد رکھئے! اگر اس پاک ہاتھ کو داغدار ظاہر کرنے یا ثابت کرنے کی کوئی ادنیٰ کوشش بھی کی گئی تو بات حضورؐ کے ہاتھ تک پہنچے گی، اور پھر خدا کے ہاتھ پر حرف آئے گا۔ اور یہ اتنی بڑی گستاخی ہوگی کہ ایمان کا شمہ بھی دل میں باقی نہ بچ سکے گا۔ اللھم لا تجعلنا منھم۔

صلح کا پیغامبر

عجیب اتفاق ہے کہ جب یہ واقعہ بیعت رضوان کا پیش آیا تو اس وقت بھی حضرت عثمانؓ صلح کا پیغام لے کر مکّہ والوں کی طرف گئے تھے اور جب سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو اس وقت بھی امن و آشتی اور صلح کے پیغامبر ثابت ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہؓ کی معیت میں مکہ روانہ ہوئے تھے قریش نے راستہ روکا اور عمرہ نہ کرنے دیا تو جنگ ہو سکتی تھی۔ جمعیت موجود تھی، جاں نثار اور جانباز صحابہؓ جانیں نچھاور کر سکتے تھے لیکن اللہ کے رسولؐ نے امن کے شہر کی تعظیم کے پیشِ نظر، مکہ کی تکریم کے لیے، شعائر اللہ کے احترام کی خاطر خونریزی پسند نہ فرمائی۔ کسی تلوار کو نیام سے باہر نہ ہونے دیا۔ اور ایسی شرائط پر جو بظاہر شکست نظر آتی تھیں لیکن فتح مبین کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں صلح کر لی اور حلم و بردباری کی تصویر بنے واپس لوٹ آئے۔

چنانچہ جب آپؐ کے جاں نثار غلام صلح کے پیامی اور ذوالنورین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا اور وہ مرکزِ امن و سلامتی اور مدینۃ الرسولؐ میں اپنوں ہی کے نرغے میں گھرا ہوا تھا اور اگرچہ اس کے پاس قوت و سپاہ اور جاں نثار ساتھی موجود تھے اُس نے مدینۃ الرسولؐ کی تکریم کی خاطر، اپنے آقاؐ کے ارشادات کی تعمیل و تعظیم کے لیے امّت محمدیہ میں فساد و خونریزی کی ابتدار اور تخم ریزی سے بچنے کے لیے اور مسلمانوں میں صلح و اتحاد کے پیش نظر اپنی جان تو ہار دی مگر صلح کی پیغامبری کا جو خلعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنایا تھا اُسے اپنے آپ سے جدا نہ ہونے دیا۔ اور قبائے خلافت جو عطائے ایزدی اور منشائے نبویؐ تھی زیب تن کئے ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو دنیا سے رخصت ہو کر اعلیٰ علیین میں اپنے آقا کی پاک مجلس میں پہنچ گئے کہ وہ وہاں اپنے عثمانؓ کے منتظر تھے۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

آخری خواب

شہادت ہی کے دن جو جمعہ کا دن تھا صبح سحری کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے روزے کی نیت فرمائی اور صبح کو خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے ہمرکاب ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ عثمانؓ! جلدی آؤ، ہم افطاری کے لیے تمہارے منتظر بیٹھے ہیں۔ آنکھ کھلی تو اپنی اہلیہ محترمہ سیّدہ نائلہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ میری شہادت کا وقت آ گیا ہے۔ خواب سنا کر اور یہ کہہ کر تیاری شروع کر دی۔ اور کلام پاک اور یادِ حق میں مشغول ہو گئے۔ دورانِ تلاوت ایک شقی بڑھ کر حملہ آور ہوا۔ اور

کلام پاک کو پاؤں سے ٹھکرایا ایک دوسرے شخص کنانہ بن بشیر نے اس زور سے پیشانی پر لوہے کی لاٹ ماری کہ حضرت عثمان رضؓ تیورا کر گر پڑے۔ زبان مبارک سے "بسم اللہ توکلت علی اللہ" نکلا اور خون کا فوارہ کلام اللہ پر جاری ہو گیا۔ اس کے بعد ہی عمرو بن الحمق نے سینے پر چڑھ کر مسلسل وار کیے۔ آپؓ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہؓ سے نہ دیکھا گیا۔ وہ بے تابانہ بچانے کے لیے دوڑیں۔ ان کی تین انگلیاں ہتھیلی سے اڑ گئیں۔ اور سودان بن حمران نے لپک کر سیدنا عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت آپ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ فسیکفیکھم اللہ و ہو السمیع العلیم۔

"شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن"

شہادت سے قبل پروانۂ رسالت

شہید امت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ انصار کی جماعت کو لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "انصار دروازے پر حاضر اجازت کے منتظر ہیں کہ دوبارہ اپنے انصار اللہ ہونے کا ثبوت دیں"۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "اگر جنگ مقصود ہے تو اس کی اجازت ہرگز نہ دوں گا۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ "قصرِ خلافت میں ہم لوگوں کی خاصی تعداد ہے اجازت ہو تو میں جانبازی کے جوہر دکھاؤں"۔ فرمایا۔ خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ میرے لیے خونریزی نہ کی جائے"۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے عرض کیا کہ آپ امام امت ہیں اور اس حال میں مبتلا ہیں اس لیے تین صورتوں میں ایک صورت اختیار فرمائیے! آپ کے پاس کافی قوت ہے ہم لوگوں کو ساتھ لے کر نکلیے اور مقابلہ کیجئے ـــــ آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر ـــــ دوسرا یہ کہ صدر دروازہ پر باغیوں کا ہجوم ہے ہم آپ کے لیے عقب سے دروازہ توڑ دیتے ہیں۔ آپ سواری پر بیٹھ کر مکہ تشریف لے جائیے وہاں حرم میں لوگ جنگ نہ کریں گے یا پھر شام چلے جائیے وہاں کے لوگ وفادار ہیں اور معاویہؓ بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ میں مقابلہ نہیں کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہلا خلیفہ نہیں بننا چاہتا جس کے ہاتھوں امت کی خونریزی کا آغاز ہو۔ مکہ بھی نہیں جاؤں گا کہ یہ خیرہ سر وہاں بھی خونریزی سے باز نہیں آئیں گے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مصداق بننا نہیں چاہتا کہ قریش کا ایک شخص مکہ کی حرمت اٹھائے گا۔ اور اس پر ساری دنیا کا آدھا عذاب ہوگا۔ شام کے لوگ ضرور وفادار ہیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میں اپنے دارالہجرت اور جوارِ رسولؐ کی نعمت کو پس پشت ڈال دوں اور اتنی عظیم ہمسائگی سے محروم ہو جاؤں"۔

ان تجاویز کے بعد شہادت ہی رہ جاتی ہے جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا اور رہتی دنیا تک حلم و بردباری اور جان نثاری کی وہ مثال چھوڑ گئے جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ انسانیت قاصر ہے۔ امت کا درد، حضور کے ارشادات کی توقیر و تعظیم اور ان پر اعتقاد و یقین اور شہادت سے شیفتگی کی ایسی مثال قطعی ناپید ہے!

ماہ ذی الحجہ اور دو حلیم شخصیات

ماہ ذی الحجہ آئے تو تاریخ انسانی کی دو یادگار حلیم شخصیات کا تذکرہ اپنے دامن میں ساتھ لے کر آتا ہے ـــ

ایک وہ عظیم و یادگار شخصیت ہے جسے خود خداوند قدوس نے اپنے کلام میں "حلیم" کے لقب سے یاد فرمایا ہے اور جس کو دس ذی الحجہ کے دن قربان گاہ تک لے جایا گیا اور اس کی آزمائش اور حلم و بردباری کے امتحان کے بعد قربان ہونے سے بچا لیا گیا۔ اور ان کی سنّت کو تازہ رکھنے کے لیے قربانی کو امتِ مسلمہ میں واجب قرار دے دیا گیا۔ وہ تھے ہمارے آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ اعلیٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے فرزندِ ارجمند۔ غلام حلیم ذبیح اللہ علیہ السلام۔

دوسری شخصیت اُسی نسل میں سے، اُسی خاندان سے اور امام الانبیاءؐ کے پروانوں میں سے امام برحق امیر المؤمنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی ہے جو حلم و بردباری کا وہ نقش صفحاتِ تاریخ پر ثبت کر گئے ہیں کہ جس کی نظیر ناپید ہے۔ آسمانی صحائف میں کسی نبی کو سیدنا اسمٰعیلؑ کے سوا "حلیم" کے لقب سے نہیں پکارا گیا اور اُسی حلیم کے خاندان کا ایک فرد اور خاتم الانبیاء والرسلؐ کا تیسرا خلیفۂ راشد حلم و بردباری کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی نظیر تاریخِ کائنات میں نہیں ملتی۔

حُسنِ اتفاق

ہے کہ آج جب یہ خطبہ پڑھا جا رہا ہے تو ۱۸ ذی الحجہ اور جمعہ ہی کا دن ہے اور جس دن سیدنا امیر عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اس دن بھی ۱۸ ذی الحجہ اور جمعہ ہی کا دن تھا۔

شہادتِ عثمانؓ
صحابہؓ و تابعین کی نظر میں

حضراتِ محترم! سیدنا عثمانؓ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ یہ ایسا المیہ تھا کہ اس نے تمام مسلمانوں کو غم بجود اور مضطرب و بیقرار اور مخالفین تک کو نادم و پشیمان کر دیا تھا۔ مفسرِ قرآن سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "اگر ساری مخلوق اس قتل میں شریک ہوتی تو اس پر قومِ لوطؑ کی طرح آسمان سے پتھر برستے۔" حضرت سعید بن زیدؓ نے فرمایا۔ لوگو! اگر تمہاری بداعمالی کی سزا میں کوہ احد تم پر پھٹ پڑے تو بھی بجا ہے۔" حضرت حذیفہؓ نے فرمایا حضرت عثمانؓ کی شہادت سے وہ رخنہ پیدا ہو گیا ہے جسے پہاڑ بھی بند نہیں کر سکتا۔" حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فرمایا کہ آج عرب کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔" حضرت ابوہریرہ زار زار روتے تھے، ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ عثمانؓ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح پاک و صاف گئے۔" امام الاولیاء سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خبر سنائی گئی تو فرمایا۔ "اب تم پر ہمیشہ تباہی رہے گی۔" حضرت انسؓ بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضرت عثمان ذی النورین کی زندگی میں اللہ کی تلوار میان میں تھی لیکن آپ کی شہادت کے بعد میان سے ایسی نکلی کہ اب قیامت تک برہنہ ہی رہیگی۔" امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد فرشتوں نے میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی اعانت ترک کر دی۔

واقعات کی گواہی

چنانچہ یہ امر واقع ہے کہ حالات نے ان اقوال کو حقیقتاً درست ثابت کر دیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا مسلمانوں سے روٹھ گیا ہے اور

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ نہ تھا آپ کی شہادت کا واقعہ نہ تھا بلکہ وحدتِ اسلامی کی شکست اور مسلمانوں کے شیرازہ کی برہمی کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ اس حادثۂ فاجعہ سے مسلمانوں میں جو تفریق پیدا ہوئی وہ تا قیامت نہ مٹے گی اور اس وقت جو تلوار نیام سے نکلی تھی ہمیشہ بے نیام رہے گی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت دراصل امّت میں فتنوں کا پیش خیمہ ہے۔

اسلام زیر بار احسان ہے

برادرانِ اسلام! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر محبوب اور عزیز تھی احادیث اور کتب سیر اس سے بھری پڑی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کرم، بے پناہ شفقت اور تربیت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور تمام صحابہؓ کو عزت بخشی اور معراج کمال تک پہنچایا لیکن اس حقیقت کے اقرار کے بعد یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اسلام اپنے تمام شعبوں میں کسی نہ کسی اعتبار سے امیر المومنین ذوالنورین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا زیر بار احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صادق و مصدوق امام الانبیاء والمرسلین کے ارشاد کے مطابق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بغیر حساب کتاب کے جنّت میں جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے اور سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت ہمارے دلوں میں راسخ فرمائے کیونکہ ایک حدیث کے مطابق ایک شخص کی نماز جنازہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صرف اس لیے پڑھنے سے انکار فرما دیا تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ سے کد رکھتا تھا ـــــ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو بغض عثمانؓ سے محفوظ رکھے۔ کیونکہ اُن سے بغض، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض خدا سے بغض ہے۔ اور یہ بغض جہنم کو لے جانے والا ہے۔

نتیجہ

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ کہ جس قوم میں مال غنیمت کے اندر خیانت کرنے عیب پیدا ہوجائے خداوند تعالیٰ اس کے دلوں میں دشمنوں کا رُعب) پیدا کردیتا ہے۔ اور جس قوم میں زناکاری پھیلتی ہے اسمیں اموات کی زیادتی ہوجاتی ہے اور جو قوم ماپنے اور تولنے میں کمی کرتی ہے (یعنی کم ناپتی اور کم تولتی ہے) اس کا رزق اُٹھا لیا جاتا ہے اور جو قوم ناحق حکم کرتی ہے (یعنی جس قوم کے امراء احکام نافذ کرنے میں عدل انصاف کو ملحوظ نہیں رکھتے اور ناحق احکام جاری کرتے ہیں، اس میں خون ریزی پھیل جاتی ہے اور جو قوم اپنے عہد کو توڑتی ہے۔ اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔

(ماخوذ: مبلغ)

سیرت شیخین اور حضرت عثمان رض

(رضی اللہ عنہم)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہ "دارالعلوم ندوۃ العلماء" لکھنؤ کی "انجمن الاصلاح" کے جلسہ میں یہ مقالہ ۲۲ اپریل سنہ ۷۹ء کو مولانا المحترم نے پڑھا۔ جبکہ صدر اجلاس نامور اہل علم و قلم مولانا السید ابوالحسن علی ندوی تھے — مولانا ندوی نے اس مقالہ کو خوب خوب سراہا۔ [redacted] گے، ماہنامہ "برہان" دہلی کے شکریہ سے پیش خدمت ہے — (ادارہ)

سب سے پہلے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ نے انتخاب خلیفہ کے لئے چھ حضرات کی جو مشاورتی کمیٹی مقرر فرمائی تھی اس کمیٹی کے چار حضرات نے جب اپنے اپنے نام واپس لے لئے اور اب معاملہ صرف دو حضرات عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان دائر سائر ہو کر رہ گیا، تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے دونوں سے الگ الگ گفتگو کی مگر سوال ایک ہی کیا اور وہ یہ کہ کیا آپ مجھ سے اس کا عہد کرینگے کہ اگر آپ خلیفہ منتخب ہو گئے تو کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور ابو بکرؓ و عمرؓ کے عمل کے مطابق کام کریں گے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت عثمان نے تو بڑی سادگی سے فرمایا نعم، لیکن طبری کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے جو جواب دیا اس کے الفاظ یہ تھے "اللّٰھم لا، ولکن علیٰ جھدی من ذالک وطاقتی"

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کی طرف بیعت کا ہاتھ بڑھایا۔ صحیح روایات کے مطابق دوسرے نمبر پر حضرت علیؓ نے بیعت کی اور اب خلافت کا عام اعلان ہو گیا، اس واقعہ میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے جواب میں لا اور نعم کا جو فرق ہے

لیکن حق یہ ہے کہ جہاں تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیرت شیخین پر عمل پیرا ہونے کے سوال کا تعلق ہے، حضرت عثمان اور حضرت علی کے جواب میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں کا مقصد و مدعا ایک ہی ہے، چنانچہ بلاذری کی انساب الاشراف جلد پنجم میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے جوابات کے الفاظ بھی یکساں ہیں یعنی دونوں حضرات نے فرمایا کہ جی ہاں! ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیرت شیخین پر اپنے علم کے مطابق مقدور بھر عمل کرینگے، ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں حضرت عثمان اور حضرت علی کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے صحابی کا بھی یہی جواب ہو سکتا تھا اور اس کے سوا دوسرا جواب ناممکن تھا "یہ کیوں؟ اس سوال کا جواب قدرے تفصیل طلب ہے جسے ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں

پہلے آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو لیجئے ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں جو آیات اور حدیثیں احکام

و معاملات اور اخلاق سے متعلق ہیں ان میں کتنی ہی آیتیں اور حدیثیں ایسی ہیں جن کی تفسیر و تشریح، بلکہ روایت حدیث اور پھر ان سب سے استنباط و استخراج مسائل و احکام میں صحابہ کرام باہم مختلف ہیں، یہی وہ اختلافات ہیں جن کی اساس پر مذاہب و مسالک فقہیہ میں گوناگوں اختلافات پیدا ہوئے، ان اختلافات سے تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، ان کے علاوہ علمائے متقدمین و متاخرین نے اس موضوع پر نہایت جامع اور مدلل کتابیں بھی لکھی ہیں، جن میں صحابہ کرام کے اختلافات اور ان کے وجوہ و اسباب سے سیر حاصل بحث کی ہے، یہاں ان اختلافات کو یا ان کی کسی نظیر کو یا جزئیہ کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں، پس جب صورت حال یہ ہے تو جب کبھی کسی صحابی سے کتاب اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کا سوال کیا جائے گا اس کا جواب لامحالہ یہی ہوگا کہ میں اپنے علم کے مطابق عمل کروں گا

رہ گیا حضرت علی کے جواب کا دوسرا جزء یعنی "و لکن علی جهدی من ذالک و طاقتی" تو جیسا کہ ہم نے ابھی کہا کہ بلاذری کی روایت کے مطابق اول تو یہ الفاظ خود حضرت عثمان نے بھی فرمائے ہیں، لیکن اگر جیسا کہ طبری میں ہے یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ حضرت عثمانؓ کی زبان سے یہ الفاظ ادا نہیں ہوئے تب بھی یہ ماننا ہوگا کہ یہ الفاظ معہود فی الذہن تھے اور ان کی مراد یہی تھی، کیونکہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا متقی اور متورع ہو، بہرحال وہ انسان ہے اور اس بناء پر اپنی بشری کمزوری اور نوعی نقائص اور کوتاہیوں کا ہمہ وقت استحضار ضروری ہے صحابہ کرام کا کیا ذکر، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ دعا فرماتے تھے: اے اللہ! ہم تیری عبادت کرتے ہیں، لیکن عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے، جو چیز میری استطاعت سے باہر ہے اس پر مواخذہ نہ کر، قرآن مجید میں "ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین"، کی دعا ہر انسان کے لئے ہے، خواہ وہ نبی ہو، یا ولی، یا صحابی ہو یا تابعی، قطب ہو یا ابدال، اس بناء پر حضرت عثمانؓ نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے یا نہیں، بہرحال ان کا مطلب یہی تھا کہ مقدور بھر قرآن و حدیث پر عمل پیرا رہوں گا"

اب آئیے اس پر غور کریں کہ سیرت شیخین پر عمل کرنے سے حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کی مراد کیا تھی؟:

اس سلسلہ میں اولاً یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سیرت شیخین اصلاً اور بالذات نہیں بلکہ صرف بلکہ صرف تبعاً اور بالفرض ہی مقصود و مطلوب ہو سکتی ہے،

یعنی چونکہ سیرت شیخین قرآن و سنت کی تعلیمات کا آئینہ اور مظہر ہیں اور ان کا نمونہ ہیں اس بناء پر جس طرح ایک عدالت خفیفہ عدالت عالیہ کے کسی فیصلہ کو نظیر بنا کر اس پر عمل کرتی ہے، لیکن خود عدالت عالیہ اپنے فیصلہ میں آزاد نہیں بلکہ خود دستور کی پابند ہے اسی طرح سیرت شیخین بعد میں آنے والوں کے لئے ایک نظیر کا کام ضرور کرتی ہے لیکن وہ خود آزاد اور خود مختار نہیں بلکہ دستور الٰہی کی جو قرآن و سنت کی شکل میں محفوظ ہے پابند ہے اس بناء پر سیرت شیخین پر عمل کرنے کا حاصل قرآن و سنت پر ہی عمل کرنا ہوگا، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کی جو تشریح ہم نے اوپر کی ہے اس کا اطلاق یہاں بھی علی وجہ التخصص والتعین ہوگا۔

ثانیاً سیرت شیخینؓ پر عمل کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کام سیاسی یا مذہبی اقدامات شیخین نے کئے ہیں بعینہ وہی کام اور وہی اقدامات حضرت عثمان بھی کریں اور ان سے سر مو انحراف یا تجاوز نہ کریں، کیونکہ خود حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد خلافت میں متعدد ایسے کام کئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کئے

مثلاً جمع و تدوین قرآن کا کام عہد نبوی میں انجام پذیر نہیں ہوا عہد صدیقی میں ہوا اور چونکہ یہ کام عہد نبوی میں نہیں ہو سکا تھا اس بناء پر جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمرؓ نے جب اس کی تجویز پیش کی تو حضرت ابوبکرؓ کو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش تھا لیکن جب حضرت عمرؓ نے یقین دلایا کہ یہ احداث فی الدین نہیں ہے بلکہ دین کے حفظ و بقا کے لئے نہایت ضروری اور اہم کام ہے تو حضرت ابوبکرؓ مجبوری میں آمادہ ہوئے اور آپ نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا، اسی طرح عہد نبوی میں مؤلفۃ القلوب کو مال غنیمت اور زکوٰۃ سے حصہ ملتا تھا حضرت ابوبکر اسے جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن جیسا کہ عیینہ بن محصن الفزاری اور عباس بن مرداس السلمی کے واقعہ سے جو اصابہ میں مذکور ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمر اس کے مخالف تھے اور فرماتے تھے اب جبکہ اسلام قوی اور مضبوط ہو گیا ہے اسے تالیف قلوب کی

ضرورت نہیں ہے ۔ آپ خلافت فاروقی کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اس میں تفردات اجتہادات حضرت عمرؓ کا ایک طویل سلسلہ نظر آئیگا جن کا عہد نبوی اور عہد صدیقی میں یا تو سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا یا تھا تو کسی اور شکل میں تھا، پس جب احکام و مسائل و معاملات کے باب میں عہد نبوی، عہد صدیقی، عہد فاروقی میں من کل الوجوہ مماثلت و یک رنگی نہیں ہے، بلکہ ان میں اضافہ اور حسب مصالح شرعیہ تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہا ہے تو پھر سیرت شیخین کی پیروی کا مطلب یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہر معاملہ میں صرف وہی کیا جائے جو شیخین کے عہد میں کیا جاتا تھا،

ثالثاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلامی معاشرہ ترقی پذیر ہے، اس کی ضرورتیں اور تقاضے روز افزوں اور گوناگوں ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ نئے نئے حالات پیدا ہو نگے اور ان کے لئے نئے احکام اور نئے فیصلے پیدا کرنے ہونگے، مثلاً حضرت عمر ایک سیاسی مصلحت کے تحت اکابر مہاجرین کو مدینہ طیبہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کے باعث یہ حضرات گھٹن محسوس کرتے تھے لیکن حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آپ نے یہ ممانعت اٹھا دی اسی طرح دولت میں اضافہ ہوا تو حضرت عمر کے عہد میں عطیات مقرر تھے حضرت عثمان نے ان پر فی کس سو درہم کا اضافہ کر دیا حضرت عمر بحری جنگ سے ڈرتے تھے اور امیر معاویہ کے بار بار اصرار کے باوجود اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن حضرت عثمان نے نہ صرف اس کی اجازت دی بلکہ ایک نہایت قوی بحری بیڑہ تیار کیا، جس نے حضرت امیر معاویہ اور عبداللہ بن ابی سرح کی امیر البحری میں بحیرۂ روم میں رومن امپائر کے پرخچے اڑا دیئے اور اسلام کی شوکت و سطوت کا پرچم بحر و بر میں اڑنے لگا اسی طرح حضرت عمر نے مسجد نبوی میں توسیع کی لیکن حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آبادی میں ترقی کے باعث مسجد نبوی میں بہت زیادہ توسیع کی اور ساتھ ہی اس کی تزئین کاری کی،

علاوہ ازیں اختلاف کبھی اسلئے بھی ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام میں بڑا تنوع اور توسع ہے مثلاً صبر کی دو قسمیں ہیں، "الصبر علی مکروہ" جیسے آلام و شدائد پر جزع فزع نہ کرنا اور دوسری قسم ہے "الصبر عن مکروہ" یعنی لذائذ حیات اور مستلذات عالم سے دامن کش رہنا، حدیث میں ارشاد ہے حفت الجنۃ بالمکارہ "اسلام میں یہ صبر کی دونوں قسمیں اعلیٰ فضیلت ہیں اور اس کا بڑا اجر و ثواب ہے لیکن جو مرتبہ و مقام صبر کا ہے اس سے کسی طرح کم شکر کا مقام نہیں ہے، یعنی اگر ایک شخص دولتمند ہے اور اس بناء پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے کے ساتھ وہ دولت کو اپنی اور اپنے متعلقین کی راحت رسانی، اعلیٰ خوراک، عمدہ پوشاک اور بلند طریق رہائش پر خرچ کرتا ہے اور اسطرح واما بنعمۃ ربک فحدث کے منشاء و مراد کو پورا کرتا ہے لاریب یہ شخص شکر کے مقام پر فائز ہوگا اور اس کا مرتبہ پہلے شخص سے کم نہ ہوگا جس کا شمار صابرین میں ہے، ایک اور مثال لیجئے ایک شخص صبر کے مقام پر فائز ہونے کے باعث صرف اپنے نفس کو ہی جہد و تعب میں مبتلا نہیں رکھتا بلکہ موضع تہمت سے بچنے اور عوام کے اعتماد کو بحال رکھنے کی غرض سے اپنے اہل و عیال اور اعزہ و اقرباء کو بھی اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور سماجی زندگی میں ان کو وہ فوائد و منافع بہم نہیں پہنچاتا جنہیں وہ اپنی پوزیشن اور اپنے وسائل و ذرائع کے باعث ان کے لئے فراہم کر سکتا تھا، بے شبہ اس احتیاط، تقویٰ اور ورع اور ایثار و قربانی کے باعث اللہ کے ہاں اس شخص کا بڑا اجر و ثواب ہے اور وہ مقربین بارگاہ ایزدی میں شامل ہونے کا مستحق ہے لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسرا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل عمیم و عظیم سے دولت و ثروت بیکراں سے نوازا ہے اور یہ مقام شکر پر فائز ہونے کے باعث خود اس دولت سے متمتع ہوتا ہے اور قرآن مجید میں ذوی القربیٰ کے جو حقوق بیان کئے گئے ہیں اور احادیث میں صلہ رحمی کی جا بجا تاکید آئی ہے ان کے پیش نظر یہ شخص اپنی دولت و ثروت سے اہل و عیال اور اعزا و اقرباء کو بھی متمتع کرتا ہے تو اب آپ اس شخص کو کیا کہیں گے؟ بے شبہ اسلام کی تعلیمات کی رو سے اس شخص کا بھی اللہ کے ہاں عظیم اجر و ثواب ہے اور یہ بھی فاما ان کان من المقربین فروح و ریحان و جنۃ نعیم ہ کا مصداق ہے"

کیا آپ کہیں گے کہ ان دو شخصوں میں تضاد ہے؟ منطقی اعتبار سے کیسا ہی تضاد ہو، لیکن اسلام کی ہمہ جہتی تعلیمات کے اعتبار سے ان میں ہرگز تضاد نہیں ہے بلکہ حقیقت ایک ہی ہے اور اس کے رخ دو ہیں اور جس طرح گلہائے رنگا رنگ کا وجود سرمایۂ زینت و رونق چمن ہوتا ہے اسی طرح افراد و اشخاص کے اس حسین و جمیل

تنوع سے سوسائٹی میں نشوونما اور ارتقا پیدا ہوتا ہے زہیر بن ابی سلمیٰ نے اس شعر میں اسی تنوع کی محاکات کی ہے،

علی مکثریہم حق من یعتریہم
وعند المقلین السماحۃ والبذل ،۔

آپ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی کے ذاتی اور شخصی کردار کا تقابلی مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مخالفین اپنی تنگ نظری سے دونوں میں تضاد محسوس کرتے اور اس لئے امیرالمومنین عثمان ذی النورین پر زبان طعن وتشنیع دراز کرتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں تھا، حضرت عثمان کی رفاہیت اور اس کے مظاہر مخالفین کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتے تھے لیکن حضرت عثمان ہمیشہ کے دولتمند تھے اور ان کی زندگی کا جو طور وطریق اب تھا وہ عہد نبوت میں بھی تھا، غزوہ تبوک کے موقعہ پر جب انہوں نے لاکھوں کی رقم سے جیش عسرۃ کی مدد کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف بار بار ہاتھ اٹھاکر ان کے لئے دعائیں مانگیں اس وقت یہ مخالفین کہاں تھے؟ کسی کی زبان سے نہ نکلا کہ یہ اسراف ہے اور ان اللہ لا یحب المسرفین ۔

ممکن ہے میرے اس فقرہ پر آپکو استغراب ہو لیکن میں یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ خود عہد نبوی میں بھی حضرت عثمان کے ایک خاص طریق معیشت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقرب خاص کے باعث بعض لوگ ان سے عناد رکھتے تھے، چنانچہ کنز العمال میں روایت ہے کہ ایک شخص کا جنازہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز پڑھانے کی درخواست کی گئی تو آپ نے یہ فرماکر انکار کر دیا کہ یہ شخص عثمان سے بغض رکھتا تھا،،

بہر حال حضرت عثمان شکر کے جس مقام رفیع پر فائز تھے، اب ذرا اس کا اظہار خود ان کی زبان حق ترجمان سے سنیئے،،

عمرو بن امیۃ الضمری سے روایت ہے کہتے ہیں میں حضرت عثمان کے دسترخوان پر وقتاً فوقتاً طعام شب کھاتا تھا، حضرت عثمان کو خزیرہ کا جو قریش کی محبوب اور لذیذ غذا تھی، بہت شوق تھا اور دسترخوان پر اس کا وجود لازمی تھا، یہ بکری کے پٹھ کے گوشت، دودھ اور گھی سے تیار ہوتی تھی، ایک دن میں نے امیرالمومنین سے کہا، یہ خزیرہ میں نے حضرت عمر کے ساتھ ان کے دسترخوان پر بھی کھایا ہے مگر وہ ایسا لذیذ نہ تھا اس میں گھی تو تھا مگر گوشت اور دودھ کا پتہ نہ تھا، حضرت عثمانؓ نے فرمایا تم سچ کہتے ہو، عمرؓ کی زندگی بڑی جفاکشی کی تھی، وہ قصداً اس قسم کی غذاؤں سے اجتناب کرتے تھے ان کے نقش قدم پر چلنا مشکل ہے میرا معاملہ یہ ہے کہ جو کچھ میں کھاتا ہوں اپنے مال سے کھاتا ہوں مسلمانوں کے مال کو ہاتھ نہیں لگاتا، میں قریش میں سب سے زیادہ دولت مند رہا ہوں، میں نے ہمیشہ عمدہ اور نرم غذا کھائی ہے، اور اب جبکہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں مجھ کو نرم غذا کی اور بھی ضرورت ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں کسی کو مجھ پر کوئی اعتراض کرنے کا حق ہے،،

خزیرہ کی طرح درمک بھی عرب کی ایک اعلیٰ اور لذیذ غذا تھی جو گوشت سے تیار ہوتی تھی، حضرت عثمانؓ کو یہ بھی مرغوب تھی، ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ روزہ افطار کیا اور درمک دیکھا تو حضرت عمرؓ کی سادہ غذا کا تذکرہ کیا، یہ سن کر حضرت عثمان نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عمرؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے عمر جو کرتے تھے دوسرا کون ایسا کرنے کی ہمت کر سکتا ہے،،

اسی طرح طبری کی ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ حضرت عثمان نے معترضین کے جواب میں فرمایا، لوگ کہتے ہیں! میں اپنے اعزہ واقربا سے محبت کرتا ہوں اور ان پر روپیہ خرچ کرتا ہوں" ہاں! بیشک میں ان سے محبت کرتا ہوں، لیکن ان کی محبت کی وجہ سے کسی کے ساتھ بے انصافی اور جور کا روادار نہیں ہوتا، اور ہاں میں ان کو عطیات دیتا ہوں لیکن یہ سب کچھ اپنی دولت سے دیتا ہوں،، مسلمان کے مال میں سے تو اس کے لئے ایک حبہ بھی نہیں لیتا، پھر یہ کوئی آج کی بات نہیں، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے زمانہ میں بھی ایسا کرتا رہا ہوں، تو کیا آج میں بخیل اور روپیہ کا لالچی بن جاؤں؟ اسی سلسلہ میں ایک روایت میں فرمایا۔ معترضین کہتے ہیں! ابوبکرؓ وعمرؓ تو اعزہ واقربا پر ایسی داد ودہش نہیں کرتے تھے میں کہتا ہوں! اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ وعمرؓ پر رحم فرمائے وہ خود بھی سختی اٹھاتے اور اپنے اعزہ واقربا سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے تھے اور اس پر ان کو اللہ کی طرف سے اجر وثواب کی توقع تھی، لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ خدا نے مجھ کو بہت کچھ عطا کیا ہے، اس لئے میں اپنی ذات پر خرچ کرتا ہوں اور اپنی دولت سے اعزہ واقربا کی خدمت بھی کرتا ہوں اور اس پر اجر وثواب کا امید وار ہوں،،

حضرت عمر فاروقؓ کا حال یہ تھا کہ

وصف خود جفاکشی کی زندگی کے عادی تھے بلکہ اپنے ہاں کے سفارتی عمال کو بھی انہوں نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ نرم لباس نہ پہنیں اور اعلیٰ قسم کے خچر کی سواری نہ لیں، لیکن حضرت عثمانؓ کے ہاں اس قسم کی قید و بند نہیں تھی، اس فرق کی وجہ خود حضرت عثمان کے لفظوں میں یہ تھی کہ حضرت عمر کے مزاج میں شدت تھی، اور آپ کے مزاج میں لینت و رافت تھی، حضرت عثمان نے مزاج کا یہ اختلاف خود متعدد مواقع پر بیان کیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ کی ایک روایت اوپر بیان ہو چکی ہے، اس کے علاوہ ایک روایت جو سمہودی کی وفاء الوفاء میں ہے، یہ ہے کہ جب مسجد نبوی میں توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کی غرض سے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرام کی ایک مجلس مشاورت طلب کی، مروان بن الحکم نے کہا اس معاملہ میں مشاورت کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے بھی مسجد نبوی میں توسیع کی تھی، مگر انہوں نے کسی سے مشورہ طلب نہیں کیا تھا حضرت عثمانؓ نے فرمایا! مروان! خاموش! عمرؓ کی بات یہ تھی کہ وہ سخت گیر و سخت مزاج تھے لوگ ان سے ڈرتے تھے، اگر وہ لوگوں سے یہ کہتے کہ گوہ کے سوراخ میں گھس جاؤ تو اس میں بھی گھس جاتے اور کوئی ان کی مخالفت نہ کرتا، لیکن میرا معاملہ یہ ہے انا لنت لھم فاخشناھم، اب سنئیے اگرچہ حضرت عثمان نے مسجد نبوی میں بہت زیادہ توسیع اور تحسین صحابہؓ کے اتفاق آرا اور ان کی رضامندی سے کی تھی، لیکن معترضین نے اس پر بھی چہ میگوئیاں اور طعنہ زنی شروع کردی، حضرت عثمانؓ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا! لوگو تمہارا عجیب حال ہے یہی کام عمرؓ نے کیا تھا تو تم نے کچھ نہ کہا اور اسے قبول کر لیا ان کے بعد اب میں نے بھی وہی کام کیا ہے تو تم ژاژخائی کرتے ہو، ہاں! اصل بات یہی ہے کہ عمر شدت پسند تھے، جو چاہتے تھے کر گذرتے تھے، لیکن میں نرم خو ہوں اس لئے تم بات بات پر میرے خلاف حرف گیری کرتے ہو،

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ خلیفہ دوم کی مزاجی خصوصیت شدت تھی اور اشدھم فی امر اللہ ہونا ان کا امتیازی وصف تھا اس کے بالمقابل لینت اور راحت و ملاطفت خلیفہ سوم کی طبیعت کا جوہر اور امتیازی نشان تھا، لیکن ذرا غور کیجئے یہ لینت و رافت کس ذات مقدس و گرامی کی خصوصیت تھی قرآن مجید میں فبما رحمة من اللہ لنت لھم اور حریص علیکم بالمؤمنین رؤف الرحیم، کس کی صفت خاص بیان کی گئی ہے؟ اس بناء پر مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے اگر اس وصف خاص میں حضرت عثمان سرور کائنات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مماثلت طبعی رکھتے تھے تو کیا کسی کو یہ کہنے کا حق ہے کیونکہ حضرت عثمان میں حضرت عمر کی سی شدت نہیں تھی اسلئے وہ سیرت عمر یا سیرت شیخینؓ کے پیرو نہیں تھے

اس بحث سے حقیقت واضح ہو گئی کہ جب حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ سے سیرت شیخینؓ پر عمل کرنے کا عہد لیا تھا تو ان کی مراد ہرگز یہ نہیں تھی کہ حضرت عثمان کی طبعی اور فطری خصوصیات اور ان کے مظاہر بھی وہی ہوں گے جو حضرات شیخینؓ کی طبعی خصوصیات اور ان کے مظاہر تھے، بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح کمال اخلاص و للہیت اور حزم و عزم کے ساتھ حضرات شیخینؓ نے احکام شریعت کا اجراء، اقامت حدود، اور عدل و انصاف کے مقتضیات کی تکمیل کر کے خلافت کے فرائض و واجبات کی انجام دہی کی ہے اسی طرح حضرت عثمان بھی کریں گے اور اس جادۂ مستقیم و حق سے منحرف نہیں ہوں گے اور ان کے دوازدہ سالہ خلافت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے انہوں نے جو عہد و پیمان کیا تھا اسے کس طرح احسن وجوہ پورا کر دیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ اس کا شاہد عینی ہے اور جیسا کہ احادیث صحیحہ میں واضح اشارے موجود ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے حبیب اور حبیب رب العالمین سے ایک پر اسرار گفتگو کے موقع پر جو عہد و پیمان کیا تھا اسے کس صبر اور تحمل و جانبازی و پامردی کے ساتھ نبھایا ہے کہ فتنوں اور آفتوں کے ہجوم میں امیر معاویہؓ کے سخت اصرار کے باوجود نہ جوار نبوی کو چھوڑنا گوارا کیا اور نہ اہل مدینہ کی راحت و آسائش کے خیال سے شام کی فوج کو مدینہ میں آنے کی اجازت عطا فرمائی، یہاں تک کہ باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا، نوجوانان و غیرہ و فدائیان قریش بار بار جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں، مگر صرف اس خیال سے کہ فتنہ کا دروازہ ان کے ہاتھوں سے نہ کھلے جس کا اقرار وہ اپنے آقا و مولا سے کر چکے تھے انتہائی بے کسی کے عالم میں جان دیدی لیکن تلوار اٹھانے کی اجازت کسی کو نہ دی، ایک وعدہ کا نباہ اور اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے؟ رضی اللہ عنہ،

حضرت عثمانؓ اگرچہ طبعاً نرم خو تھے لیکن دین اور احکام شریعت میں مداہنت ایک لمحہ کے لئے گوارا نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ ولید بن عقبہ جو حضرت عثمان کے سوتیلے بھائی اور کوفہ کے گورنر تھے جب ان کے خلاف بادہ نوشی کا الزام ثابت ہو گیا تو حضرت عثمان نے ان کو معزول ہی نہیں کیا بلکہ اس جرم کی سزا بھی دی اور جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ اجرائے حد کا معاملہ حضرت علی کے سپرد کیا اسی طرح حمران بن ابان جو حضرت عثمان کا خادم خاص تھا جب حضرت عثمان کو علم ہوا کہ ولید بن عقبہ کے خلاف سرکاری طور پر جو تحقیق ہو رہی ہے حمران اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے تو حضرت عثمان نے فوراً اس کو [illegible] ہی نہیں کیا بلکہ جلا وطن کر دیا، عمرو بن العاصؓ جو شہرۂ رعب داب اور جاہ و جلال کے فاتح و گورنر مصر تھے جب حضرت عثمان کو یہ محسوس ہوا کہ مصر سے جتنا خراج وصول ہونا چاہیے اتنا نہیں ہو رہا ہے تو پہلے انہوں نے گورنر مصر سے جواب طلبی کی، مگر جب ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو حضرت عثمان نے فوراً ان کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا گورنر مقرر کیا، اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے گورنر مقرر ہوتے ہی مصر سے آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہو گیا، اور عمرو بن العاصؓ نہیں بلکہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، ابو موسیٰؓ اشعری، اور مغیرہؓ بن شعبہ اور سعیدؓ بن العاص وغیرہم جن کو ایڈمنسٹریشن کے نقطۂ نظر سے حضرت عثمانؓ نے جب مناسب سمجھا گورنری سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ دوسروں کو گورنر مقرر کر دیا، معترضین کو اس پر بھی سخت اعتراض تھا اور اس اعتراض کے دو جزو تھے، ایک یہ کہ حضرت عثمان اکابر صحابہ کو ان کے عہدہ سے معزول کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی جگہ نوجوانوں کو جو تجربہ کار نہیں ہیں اور ان کے خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتے ہیں نہایت اہم عہدوں اور مناصب پر مقرر کرتے ہیں۔ اب آئیے اعتراض کے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیں"۔

امر اول کی نسبت گذارش یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح، تقویٰ و طہارت، اور طویل صحبت و معیت نبوی کے باعث اکابر صحابہ و مہاجرین کا جو مرتبہ و مقام تھا حضرت عثمان سے زیادہ اس سے اور کون ـــــ باخبر ہو سکتا تھا، لیکن ایڈمنسٹریشن اور نظم و نسق حکومت کے تقاضے اور اس کی مصلحتیں امر دیگر ہیں، اس بنا پر ضروری نہیں کہ جو شخص اعمال صالحہ اور مکارم اخلاق کے اعتبار سے ایک مرتبہ و مقام پر فائز ہو وہ بحیثیت گورنر یا قائد فوج کے بھی اپنی منصبی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، چنانچہ عزل و نصب کی جو پالیسی حضرت عثمانؓ نے اختیار کی آپ سے پہلے حضرت عمرؓ بھی اسی پالیسی پر عمل کر چکے تھے، حضرت خالد بن الولیدؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ یہ سب وہ اکابر صحابہ ہیں جن کو حضرت عمر نے مناصب عالیہ پر فائز کیا، اور پھر کچھ مدت بعد کسی سیاسی اور انتظامی مصلحت کے پیش نظر ان کو ان مناصب سے سبکدوش کر دیا، پس کل جو چیز حضرت عمر کے لئے روا تھی، آج وہ حضرت عثمان کے لئے کیوں ناروا اور قابل اعتراض ہو سکتی ہے، علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی عامل کا طرز رہائش اس کی آمدنی سے زیادہ دیکھتے تھے تو اس کے املاک و جائداد میں مقاسمہ کر لیتے تھے، اس کے برخلاف حضرت عثمان کا معمول یہ تھا کہ کسی کو اگر معزول کرتے تھے تو اس کے مالی نقصان کی تلافی اپنے عطیات اور بخششوں کے ذریعہ کر دیتے تھے، طبری میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں"۔

اب رہا امر دوم! اس کے بھی دو جز ہیں ایک گورنروں کا نوجوان ہونا اور دوسرا ان کا اموی اور حضرت عثمان کا عزیز و قریب ہونا۔ ان دونوں میں سے پہلے جز کا جواب یہ ہے کہ نوجوانوں کو اہم ذمہ داریوں پر فائز کرنا حضرت عثمان کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ عہد نبوی اور عہد شیخین میں بھی اس کے متعدد واقعات پیش آ چکے تھے، اس کی چند مثالیں سن لیجئے

(الف) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد عتاب بن اسید کو جو بائیس برس کے اموی نوجوان تھے مکہ کا گورنر مقرر فرمایا ۔ آپ نے حضرت خالد بن ولید کو جو ۸ھ میں مسلمان ہونے کے باعث جونیئر تھے فوجوں کا کمانڈر اور سینئر صحابہ کا لیڈر بنایا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اٹھارہ انیس برس کے نوجوان اسامہ بن زید کو جو کہ آپ کے مولیٰ تھے شرق اردن کی مہم کا کمانڈر انچیف مقرر فرمایا حالانکہ اکابر مہاجرین و انصار اس فوج میں شامل تھے

(ب) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسامہ کی نوعمری کے باعث حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو مشورہ دیا کہ اسامہ کے بدلہ میں کسی سن رسیدہ کو فوج کا کمانڈر

اپچیف مقرر کیا جائے مگر حضرت ابو بکرؓ نے یہ تجویز منظور نہیں کی، علاوہ ازیں باغیوں کی ایک جماعت کی سرکوبی کے لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جو ایک فوجی دستہ بھیجا تھا اس کے کمانڈر ابو جہل کے نوعمر فرزند عکرمہ تھے — پھر حضرت انس بن مالکؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور صرف اکیس بائیس برس کے نوجوان تھے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو بحرین کا عامل مقرر کیا،

(ج) حضرت عمر فاروقؓ کا بھی یہی حال تھا، آپ نے حضرت امیر معاویہ کو نسبتاً کم عمر اور نوجوان ہونے کے باوجود شام کی فوجوں کا کمانڈر اور ان کے بھائی عقبہ کو جو نوجوان تھے قبائل کنانہ کا عامل مقرر کیا۔

غرضیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کے نزدیک کسی عہدہ پر تقرر کے لئے صرف لیاقت و قابلیت اور اس کی استعداد و صلاحیت تھی، عمر، قبیلہ و خاندان، اور قدیم الاسلام اور جدید الاسلام ہونے کے فرق کا ہرگز کوئی اعتبار و لحاظ نہ تھا اور عدل جس کے معنی وضع الشئی فی محلہ ہیں اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔۔۔"

اب رہا امر ثانی کا جزو دوم یعنی یہ کہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ نئے گورنر اور عامل اموی اور امیر المومنین کے عزیز قریب تھے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ایڈمنسٹریشن اور قیادت عرب کی جو استعداد صلاحیت بنو امیہ میں تھی وہ بنو ہاشم یا دوسرے قبائل کے لوگوں میں نہ تھی، چنانچہ شیخینؓ کے دور خلافت میں بھی خالدؓ بن ولید، عمرو بن عاصؓ، امیر معاویہؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، جو بنو امیہ کے معدن کے گوہر آبدار تھے الگ سے الگ نمایاں اور ممتاز تھے، پھر اسلام کا وہ کونسا اصول ہے جس کے ماتحت ایک فرمانروا کے لئے اپنے کسی عزیز و اقارب کو کسی عہدہ کی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت کے باوصف اس عہدہ و منصب پر فائز کرنا ناجائز اور ممنوع ہو؟ اگر ممنوع ہے تو صحیح بخاری کی حدیث "انصر اخاک ظالماً او مظلوماً" کا کیا مطلب ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کسی عہدہ پر تقرر کے لئے صرف قابلیت اور صلاحیت شرط ہے اور سن و سال اور اسلام میں قدامت و حدوث کا فرق نہیں اسی طرح یگانہ و بیگانہ، عزیز اور غیر عزیز کا فرق و امتیاز نہیں، اب ہم اس نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے خاندان بنو امیہ کے جن نوجوانوں کو گورنر یا امیر جیش مقرر کیا تھا ان کے زندہ جاوید اور عظیم الشان کارنامے متعلقہ عہدوں کے لئے ان کے استحقاق کی دلیل بین ہیں۔

عبد اللہؓ بن سعد بن ابی سرحؓ مصر کے بحری بیڑہ کا امیر البحر تھا، اس نے مصر سے کبھی بری اور کبھی بحری سفر مغرب کی سمت شروع کیا تو لیبیا، تیونس، الجزائر اور مراکو کو فتح کرتا ہوا جبرالٹر پر رکا۔ ایک دوسرے اموی نوجوان عبد اللہ بن عامر بن کریز نے مشرق میں تاخت شروع کی تو فارستان، خوزستان، ترکستان و خراسان پر فتح کا پرچم اڑاتا ہوا کابل پہنچ کر دم لیا، کیا ان کارناموں کو تاریخ کا حافظہ کبھی فراموش کر سکتا ہے

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

علاوہ ازیں عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح اگرچہ حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے لیکن ان کی لیاقت و قابلیت کے باعث حضرت عمر فاروقؓ نے خود ۲۳ھ میں مالیات مصر کا عہدہ تفویض کیا تھا، عہد فاروقی اور پھر عہد عثمانی میں جب تک یہ مصر میں رہے لوگوں کے ممدوح رہے کتاب الولاۃ والقضاۃ کا مصنف کندی لکھتا ہے،

"وملک عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح امیراً علی مصر فی ولایۃ عثمان کلھا محموداً فی ولایتہ، وغزا ثلاث غزوات کلھا لھا شان و ذکر"

اب عبد اللہ بن عامر بن کریز کو دیکھئے جو حضرت عثمانؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے عزل کے بعد ان کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا، اس وقت یہ پچیس برس کے نوجوان تھے، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے، عبد اللہ بن عامر بے حد شجاع اور عظیم قائد حرب ہی نہ تھے بلکہ نہایت سخی، فیاض طبع اور اعلیٰ فضائل و کمالات کے حامل تھے، گورنر ہونے سے پہلے تجارت کرتے تھے، اس لئے دولت مند تھے اور ان کا شمار اجواد عرب میں ہوتا تھا، انہوں نے گورنری کے زمانہ میں فتوحات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، رفاہ عام کے بڑے کام کئے، جگہ جگہ مہمان خانے بنائے، نہریں نکالیں، پل تعمیر کئے، ان کے تعمیری کاموں کی فہرست خاصی طویل ہے، ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں انہیں شمار کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے "ولہ فی الارض آثار کثیرۃ"، انہی وجوہ سے ہر شخص ان کی تعریف کرتا اور وہ عوام و خواص سب کے ممدوح اور محبوب تھے [illegible]

ایک تیسرے اموی نوجوان جن کو حضرت عثمان نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا، سعید بن العاص تھے ان کے مجد و شرف کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ وفات نبوی کے وقت ان کی عمر نو برس تھی، ایک مرتبہ یہ حضور کے پاس موجود تھے کہ ایک عورت آئی اور بولی "میں یہ چادر اکرم العرب کو نذر کرنا چاہتی ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید بن العاص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "اس بچہ کو دیدو۔ یہ اکرم العرب ہے"۔ یہ ارشاد حق بنیاد اس بچہ کے طالع مسعود کا ضمنی اعلان تھا۔ چنانچہ علم و فضل، شجاعت و شہامت، فہم و تدبر، جود و سخا اور صلاح و ورع کے اعتبار سے سعید بن العاص اپنے عہد کی ایک مثالی اور نمایاں شخصیت تھے۔ اسماء الرجال کی کتابیں ان کے فضائل و مناقب کے بیان میں رطب اللسان ہیں۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ابن حبیب بغدادی کتاب المحبر میں لکھتے ہیں وکان ینحر فی کل یوم جزورا لیطعمھا الناس خطابت کی شان یہ تھی کہ جاحظ کا بیان ہے کان من الخطباء المبرزین لم یوجد کالتحبیر والتحبیر ولا کارتجاله ارتجالا، علم و فضل اور ثقاہت کا اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کے جمع و تدوین کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی سعید بن العاص اس کے ممبر تھے، اور زبان و محاورہ کی نگرانی ان کے سپرد تھی، حضرت عثمان نے اپنی صاحبزادی ام عمرو کو ان کے نکاح میں دے دیا اور ۳۰ھ میں ولید بن عقبہ کو معزول کیا گیا اور ان کی جگہ سعید بن العاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد سعید بن العاص نے متعدد فتوحات کیں، دور رس مالی و اقتصادی اصلاحات کیں اور رفاہ عامہ کے بعض اہم کام کئے جو تاریخ میں یادگار رہیں۔"

حضرت عثمان کے رشتہ دار گورنروں میں بدنام ولید بن عقبہ ہے، اگرچہ ہم نے اپنی کتاب عثمان ذی النورین میں بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ ان پر بادہ نوشی کا الزام محض تہمت ہے، اور حضرت عثمان نے حضرت علی کے ہاتھوں ضرب خمر کی جو سزا ان کو دلوائی تھی تو اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس طرح ایک فتنہ کا سد باب کرنا ان کے پیش نظر تھا، یا اہل کوفہ، فتوح البلدان میں بلاذری کے بیان کے مطابق جن کی شرارت پسندی سے حضرت عمر فاروق بھی سخت نالاں اور شکوہ سنج تھے، انہوں نے شرارت کر کے ولید بن عقبہ کے خلاف جھوٹی شہادت اس طرح بہم پہنچائی کہ حضرت عثمان کے لئے اجرائے حد ناگزیر ہو گیا، تاہم ذاتی اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ولید بن عقبہ بھی اس شان کے اموی تھے کہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بعض قبائل کا عامل یعنی محصل زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا، ولید بن عقبہ نے یہ خدمت جس جوش و کوشش سے اور امانت و دیانت سے انجام دی اس کا یہ اثر تھا کہ عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں بھی وہ متعدد مناصب پر فائز رہے، اس شہرت اور مقبولیت کے باعث جب ۲۵ھ میں حضرت عثمان نے ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو اہل کوفہ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، طبری کا بیان ہے: قدم الکوفة فکان احب الناس فی اھلھا وارفقھم فکان بذلک خمس سنین ولیس علی دارہ باب ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں "کان من رجال قریش ظرفا و حلما و شجاعة و ادبا وکان من الشعراء المطبوعین" ولید بن عقبہ ۹ھ سے ۳۰ھ تک یعنی مسلسل بیس برس عہد نبوی، عہد شیخین اور خلافت عثمانی کے پانچ برس میں مختلف عہدوں اور منصبوں پر نیک نامی سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد اچانک ان کے خلاف اہل کوفہ میں شورش پیدا ہوتی ہے اور اس کی صدائے بازگشت دور دور سنائی دیتی ہے، یہ سب کچھ کیا ہے؟

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں"
"ورنہ کیا بات کر نہیں آتی"

بہرحال آپ نے دیکھا! یہ تھے وہ حضرت عثمان کے رشتہ دار گورنر اور قائدین جنگ جن کے بدنام اور قرابت کی وجہ سے حضرت عثمان کو مطعون کرنے میں مخالفین نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا — کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ان حضرات کو اہم ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر کرنا سیرت شیخین سے انحراف ہے؟ اگر اس زمانہ میں حضرت عمر ہوتے تو کیا وہ خود ان حضرات سے خدمت نہ لیتے؟

اقربا نوازی کے اعتراض کے علاوہ حضرت عثمان پر ایک بڑا اعتراض احداث فی الدین کا بھی ہے مثلاً ہرمزان کے قتل پر حضرت عثمان نے حضرت علی کی سخت مخالفت کے باوجود عبیداللہ بن عمرؓ سے قصاص نہیں لیا اور صرف دیت پر اکتفا کیا اور وہ دیت بھی

عذر ادا کی، منیٰ میں بجائے دو کے چار رکعتیں پڑھیں، گمشدہ اونٹ کو لوٹا لگائی، منبر جس کی سیڑھی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تھے شیخین کے طریقہ کے خلاف حضرت عثمان نے خود اس پر بیٹھنا شروع کیا، جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا، حمیٰ سرکاری جانوروں کے لئے مخصوص کی، منیٰ میں خیمہ لگایا، دار الامارۃ کو بہت وسیع اور شاندار بنایا، شراب نبیذ پر حد جاری کی، اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں، مسجد نبوی میں توسیع کے ساتھ تزئین کاری بھی کی، وغیرہ وغیرہ،،

ہم نے ان پر اور ان جیسے دوسرے اعتراضات پر اپنی کتاب میں اصول شریعت، فقہ، اور تاریخ کی روشنی میں مفصل بحث کی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش! البتہ مقالہ کے موضوع کی مناسبت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا امور احداث فی الدین ہیں تو حضرت عمرؓ کے اجتہادات کثیرہ میں سے ایک ایک اجتہاد احداث فی الدین ہے، اور اگر نہیں ہے تو جو تاویلیں اور توجیہات اس کے لئے کی جائیں گی وہ امور زیر بحث کے لئے بھی روا ہونگی، خلافت عثمانی کے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت اسلام دور بداوت سے نکل کر دور حضارت میں داخل ہو رہا تھا۔ اگرچہ حضرت عمر طبعاً متنبی کے شعر:

حسن الحضارة مجلوبٌ بتطرية
وفي البداوة حسن غير مجلوبٍ

کے مطابق بداوت کی طرف مائل تھے اور حضرت عثمانؓ دور حضارت کے مقتضیات و مطالبات کا لحاظ و پاس رکھنے کے باعث عروس جمیل کے لئے لباس حریر پسند کرتے تھے، اس ایک فرق کے علاوہ بنیادی طور پر حضرت عثمان اسوۂ فاروقی کی پابندی کرتے اور اس میں تغیر و تبدل پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ طبری میں ہے کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو آپ نے حضرت عمر کی وصیت کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا، حضرت عمرو بن العاص مصر کے اور امیر معاویہ شام کے گورنر تھے، حضرت عثمان نے ان دونوں کو ان کی جگہوں پر رکھا شام میں جو عمال حضرت عمر نے مقرر کئے تھے حضرت عثمان نے ان سب کو اسی طرح بحال رکھا۔ لیکن جوں جوں حالات بدلتے گئے آپ ان میں تبدیلی پیدا کرتے گئے، مثلاً عمیر بن سعد ایک حادثہ میں زخمی ہو کر سخت بیمار اور صاحب فراش ہو گئے اور انہوں نے استعفا دیدیا، تو حضرت عثمان نے ان کو سبکدوش کر کے امیر معاویہ کو عمیر بن سعد کے منصب کا انچارج بنادیا، اسی طرح عبد الرحمن بن علقمہ الکنانی جو فلسطین کے عامل تھے جب ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمان نے فلسطین کا چارج بھی امیر معاویہ کو منتقل کر دیا،

غرض کہ اس طرح شدہ شدہ شام کے نظم و نسق میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی، یہاں تک کہ خلافت فاروقی میں شام دو حصوں میں تقسیم تھا اور ہر حصہ کا چیف ایڈمنسٹریٹر الگ الگ تھا جن میں سے ایک امیر معاویہ تھے، بعد ازاں جب انتظامی مصلحت سے حضرت عثمان نے جب صوبوں کی تشکیل جدید کی تو شام کے دونوں حصوں کو ملا کر ایک صوبہ بنادیا اور امیر معاویہ اس پورے صوبہ کے گورنر مقرر ہو گئے، تو کیا کوئی شخص اس تبدیلی کو اسوۂ فاروقی کی خلاف ورزی کہہ سکتا ہے!

طبری نے ۲۹ھ کے واقعات کے سلسلہ میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس معاملہ میں حضرت کی پالیسی اور نقطہ نظر سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان نے امیر معاویہ اور تمام عمال کے نام ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں تحریر تھا:۔

اما بعد فقوموا على ما فارقتم عليه عمر ولا تبدلوا ومهما اشكل عليكم فردوه الينا، نجمع عليه الامة ثم نرده عليكم واياكم ان تغيروا فاني لست قابلا منكم الا ما كان عمر يقبل"

غور کیجئے اس مختصر مراسلہ سے تین اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں

(۱) یہ مراسلہ ۲۹ھ میں بھیجا گیا یعنی حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے کے پانچویں برس،،

(۲) حضرت عثمان سخت تاکید کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے آئین نظم و نسق کی پابندی کی جائے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کیا جائے،،

(۳) تیسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ امیر المومنین فرماتے ہیں! اگر تم لوگوں کو حضرت عمر کے آئین پر عمل کرنے میں کوئی دشواری ہو تو ہم سے رجوع کرو، ہم اس معاملہ کو امت کے سامنے برائے مشورہ پیش کرینگے۔ پھر امت کا جو متفقہ فیصلہ ہوگا اس سے تم کو مطلع کرینگے، اس تیسری شق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ امیر المومنین حضرت عثمانؓ خود سر اور خود رائے ہرگز نہیں تھے جیسا کہ ان کے مخالفین کہتے تھے، بلکہ ان کا مزاج سر تا سر جمہوری تھا اور اس لئے وہ جو کام کرتے تھے

"امت کی رائے اور مشورے سے کرتے تھے"۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی، نقطہ نظر اور طریق حکومت بالکل وہی تھا جو حضرات شیخین کا تھا، اور خلافت کے نہج میں، اس وقت تک کوئی فرق اور انحراف پیدا نہیں ہوا تھا چنانچہ انساب الاشراف بلاذری میں ہے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا "میرے پاس حضرت عثمان پر طعن کرنے والوں کی ایک جماعت آئی، تو میں نے کہا، وہی کام حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر نے کئے تو کسی نے لب کشائی نہیں کی، تو پھر حضرت عثمان پر اعتراض کیوں کرتے ہو میرے یہ کہنے پر یہ لوگ لاجواب ہو گئے اور کھسیانے ہو کر چلے گئے"۔ اسی قسم کا ایک قول حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں حضرت عبداللہ بن عمر کا نقل کیا ہے، فرماتے ہیں "لقد عیبت علی عثمان اشیاء لو فعلها عمر ما عیبت علیه"

اب سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب یہ معاملہ اتنا صاف اور واضح ہے تو پھر حضرت علی معترضین کے نمائندہ کی حیثیت میں کیوں نظر آتے ہیں؟ جواباً گزارش ہے کہ ہم نے اپنی کتاب میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کے تعلقات اور ان کی باہم شکر رنجیوں اور ان کے اسباب پر مفصل گفتگو کی ہے، یہاں مختصراً یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کوئی بات خواہ کتنی ہی غلط اور بے بنیاد ہو اگر اسے بار بار شد و مد سے لوگ بیان کریں تو اچھے اچھے سمجھدار اور عقلمند اشخاص اس سے متاثر ہو جاتے ہیں، اور اسے سچ سمجھنے لگتے ہیں، چنانچہ واقعات سے ثابت ہے کہ حضرت علی معترضین کی باتوں سے غیر شعوری طور پر متاثر نہیں تھے، اگرچہ یہ ضرور تھا کہ انہوں نے حضرت عثمان کا ادب و احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا اور جو مدد ان کی وہ کر سکتے تھے اس سے کبھی دریغ نہیں کیا، اصل بات یہ ہے کہ خوارج اور شیعہ کے متعلق مشہور یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے واقعہ تحکیم کے بعد پیدا ہوئے ہیں حالانکہ سچ یہ ہے کہ یہ دونوں اس واقعہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے حضرت علی نے خوارج کے طبقہ کو بروقت نہیں پہچانا، بعد میں جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو انہوں نے اس طبقہ کو پہچانا اور نہروان میں نہایت سخت جنگ کر کے ان کی قوت کا خاتمہ کیا، اس وقت حضرت علی کو محسوس ہوا کہ حضرت عثمان کو جو واقعات پیش آئے وہ ان کو بھی آنے والے تھے اسی بنا پر اگر اس وقت بیدار مغزی سے کام لیکر گربہ کشتن روز اول پر عمل کیا جاتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا چنانچہ البدایہ والنہایہ ابن کثیر میں ہے کہ حضرت علی نے ایک مرتبہ فرمایا، "اکلت یوم اکل الثور الابیض" یہ جملہ عربی کا محاورہ اور ضرب المثل ہے زمخشری نے المستقصی فی امثال العرب میں اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ کسی جنگل میں تین بیل تین مختلف رنگوں کے رہتے تھے سفید، سیاہ اور سرخ، ایک شیر اسی کے پڑوس میں کہیں رہتا تھا اس نے ان تینوں بیلوں کو ہڑپ کر جانے کا پروگرام بنایا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی سے کام لیا۔ چنانچہ اس نے پہلے سیاہ اور سرخ بیلوں کو سفید بیل کے خلاف اکسایا اور اسے چٹ کر گیا، پھر سرخ بیل کو سیاہ بیل کے خلاف اکسایا اور اسے بھی ہڑپ کر گیا اب سرخ بیل اکیلا رہ گیا تھا، اس کو لقمہ بنانا کیا مشکل تھا آخر کار اس کا بھی خاتمہ کر دیا اس بنا پر حضرت علی کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ "درحقیقت میں بھی اسی دن قتل کر دیا گیا تھا جس دن حضرت عثمان شہید کئے گئے"۔

بہر حال جس فتنہ کے دروازہ کو عثمان ذی النورین نے اپنا خون دیکر کھلنے نہ دیا تھا اب وہ وا ہو چکا تھا اور ساری امت کو اسی خون کا تاوان بھگتنا تھا چنانچہ شہادت حضرت عثمان کے چند ماہ بعد جنگ جمل ہوئی پھر صفین کی جنگ ہوئی، نہروان میں معرکہ کارزار گرم ہوا جس میں مورخین کے محتاط اندازہ کے مطابق مجموعی طور پر کم و بیش نوے دو لاکھ مسلمان کھیت رہے، حضرت طلحہ حضرت زبیر، حضرت عمار بن یاسر شہید ہوئے اور آخر میں جو جام شہادت حضرت عثمان نے نوش کیا تھا وہ حضرت علی اور ان کے دونوں جگر گوشوں کو بھی نوش کرنا پڑا، پھر یزید کی حکومت میں واقعہ حرہ پیش آیا اس نہایت بھیانک واقعہ میں جب اہل مدینہ کا قتل ہو رہا تھا تو ابن عبد ربہ کی العقد الفرید کی روایت کے مطابق کسی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا حضرت یہ کیا ہو رہا ہے فرمایا "یہ عثمان کا خون رنگ لا رہا ہے" "یقتلهم بعثمان ورب الکعبة"

حضرات خلفائے راشدین کے ایام پر سرکاری تعطیل ملی غیرت کا تقاضا ہے۔

(ادارہ)

ڈاکٹر زاہد الحق فریدی

قسط نمبر (۳)

اسلام اور جدید میڈیکل سائنس

(۴) لا یبولن احدکم فی الماء الدائم

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی،

ترجمہ۔ تم میں کوئی شخص ساکن پانی میں پیشاب نہ کرے،

کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے غلاظت پھیلتی ہے، اور اس میں مختلف قسم کے جراثیم پرورش پاکر مختلف بیماریاں پھیلاتے ہیں

(۵) من غسل میتا فلیغتسل، (مسند احمد)

ترجمہ، جو شخص میت کو غسل دے وہ خود بھی بعد میں غسل کرے،

اس سے بھی متعدی امراض میں روک تھام میں مدد ملتی ہے،

(۶) اجعلوا الطریق سبعۃ اذرع،

(بخاری، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ۔ گلی کی چوڑائی (کم ازکم) سات ہاتھ رکھو،

حفظان صحت کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ گلیاں اور سڑکیں کشادہ ہوں، تاکہ آمدورفت میں دشواری نہ ہو، تازہ ہوا اور دھوپ وافر مقدار میں سبکو میسر آسکے، اس سے بھی بہت سے متعدی امراض کی روک تھام میں مدد ملتی ہے دھوپ بہترین جراثیم کش ہے،

(۷) طاعون اور دوسری متعدی بیماریوں سے بچاؤ،

حضرت اسامہ بن زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا، واذا سمعتم بالطاعون بارض فلا تدخلوا علیہ واذا وقع وانتم بارض فلا تخرجوا منہا، (نسائی)

ترجمہ، اگر تم کسی علاقے میں طاعون کے متعلق سنو تو وہاں مت جاؤ اور اگر اس جگہ موجود ہو تو پھر وہاں سے نکل کر کسی دوسرے مقام کا رخ نہ کرو، ایک دوسری حدیث مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گاؤں یا بستی سے جس میں کوئی وبا پھوٹ پڑے وہاں سے نکل کر کسی دوسرے مقام کا رخ کرنے سے سخت منع فرمایا۔

وبائی بیماریوں سے بچاؤ کا اس سے بہتر اصول ابھی تک وضع نہیں کیا جا سکا اس لئے دنیا میں بین الاقوامی قانون ہے کہ (INTERNATIONAL-LAW) ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے مختلف وبائی بیماریوں کے ٹیکے (VACCINATION) وغیرہ لگوانے پڑتے ہیں، اور اگر کسی ملک میں وبائی مرض پھوٹ پڑے تو دوسرے ممالک اس ملک کے شہریوں پر اپنے ملک میں داخلے کی پابندی لگادیتے ہیں،

(۸) جذام (LAPERS) سے بچاؤ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اتقوا المجذوم کما تتقوا الاسد (بخاری)

ترجمہ کوڑھی سے ڈرو جیسے شیر سے ڈرتے ہو،

حضرت عبداللہ بن ا کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جب کسی کوڑھی سے بات کرو تو اپنے اور اسکے درمیان کم ازکم دو تیروں کا فاصلہ رکھا کرو۔

جدید میڈیکل سائنس کو حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ کوڑھ کا مرض چھوت سے پھیلتا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے ڈاکٹر صاحبان تندرست انسانوں کو ان سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں، انگریزوں نے جذام کے چھوت سے بچاؤ کیلئے جذامی قانون (LEPERS-ACT) نافذ کیا تھا جس کی رو سے کوئی کوڑھی ریل یا بس میں سفر نہیں کر سکتا،

۹۔ حضرت عبداللہ بن مغفل روایت کرتے ہیں کہ حضور نے مدینہ منورہ میں تمام آوارہ کتے ہلاک کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ حضورؐ نے کتے کو نجس قرار دیا اسے گھروں میں رکھنے سے منع فرمایا، جس شکار کو کتا منہ لگادے اس کو کھانے سے منع فرمایا، جس برتن میں کتا منہ ڈال دے اسے سات بار دھوئے بغیر ناپاک قرار دیا کتے کے لعاب دہن کو نجس قرار دیا،

ہمارے بڑے بڑے شہروں میں کتے مار

سے شوشہ ہوتے ہیں برش ہو لے ہونگے، پھر جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یا دیکھئے کے کاٹنے سے جو بیماری (RAB IES) ہوتی ہے، اسکے جراثیم کتے کے لعاب دہن میں ہوتے ہیں"

دانتوں اور منہ کی صفائی

من اکل فلیتخلل" (دارمی)
ترجمہ، جو شخص کھانا کھائے اسے خلال کرنا چاہیئے۔

طھروا افواھکم (بزار)
ترجمہ، اپنا منہ صاف رکھو۔

لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوۃ" بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ترجمہ، اگر میں اپنی امت پر دشواری نہ سمجھتا تو انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستاک عرضا
بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی۔
ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرضاً مسواک کیا کرتے تھے۔

پیٹ کی اکثر بیماریاں، دانتوں کی بیشتر بیماریاں، منہ کی چند بیماریاں، کھانے کے بعد منہ اور دانت اچھی طرح صاف نہ کرنے سے ہوتی ہیں۔

کھانے کے بعد دانتوں میں کھانے کے چھوٹے چھوٹے ذرے پھنس جاتے ہیں، اگر انہیں خلال کرکے یا دانتوں کی اچھی طرح صفائی کرکے نہ نکالا جائے تو یہ دانتوں میں سڑ جاتے ہیں اور ان میں مختلف جراثیم پرورش پاتے ہیں اور دانتوں میں سے خون آنے لگتا ہے اور ان میں پائیوریا، ماسخورہ وغیرہ کی شکایت ہو جاتی ہے، دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے منہ پک جاتا ہے، گندے اور پیلے دانت بدنما بھی لگتے ہیں، منہ سے بدبو بھی آنے لگتی ہے، اس شخص کا کسی محفل میں بیٹھنا دشوار ہو جاتا ہے،

جدید میڈیکل سائنس نے حال ہی میں معلوم کیا ہے کہ دانتوں کا برش یا مسواک عرضاً کرنی چاہئے، طولاً مسواک یا دانتوں کا برش کرنے کے کئی نقصانات ہیں، اسلئے اب ڈاکٹر صاحبان بھی عرضاً کرنے کی تلقین کرتے ہیں

دین اسلام

آنسہ اے کے ـــــ فیصل آباد

اس موضوع پر "تفصیلاً" روشنی ڈالنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے لفظ "الدین" اور "اسلام" کی وضاحت کی جائے۔ عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنی ہیں جس میں سے ایک طریقہ اور روش ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک رہا۔

لغت کے اعتبار سے اسلام کے معنی فرمانبرداری کے ہیں یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا۔ خدا کی بادشاہی اور فرمانروائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا۔

اصطلاحی معنوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے ہر قول و فعل کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع رکھے دوسرے الفاظ میں اسلام ایک مکمل مذہب اور ضابطہ حیات ہے۔ یعنی اسلام سے مراد ایسے نظام کا قیام اور تکمیل ہے جس کی اطاعت سے ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہو سکے۔ اسلام ایک سیدھا سادہ صاف و شفاف نصاب تعلیم اور ضابطہ عمل ہے۔ اس میں نہ بے مقصد فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں ہیں اور نہ بے مطلب عالم خیال کی قیاس آرائیاں بلکہ اسلامی نظام نہایت سیدھے سادے

اصولوں پر قائم ہے۔ اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں ابہام نہیں، کجی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اصول و ضوابط ہیں۔ یہ وہ قانونِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند محکم، اٹل اور غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جس قدر اصول و ضوابط کی ضرورت تھی وہ سب اس میں دیئے جا چکے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قرآن پاک میں اسلام کو اصل اور سچا دین کہا گیا ہے یہ دین فطرت کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ روم میں فرمایا ہے:-

ترجمہ:- (اے پیغمبر اسلام!) ہر طرف سے منہ موڑ کر اس دین کی طرف اپنا رخ پھیر لو جو اس فطرتِ خداوندی کے عین مطابق ہے جس پر خدا تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح اور سچا دین ہے۔ لیکن افسوس اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔"

اللہ تعالیٰ سورۃ آلِ عمران میں فرماتے ہیں:-

ترجمہ:"جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جاویگا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ہوگا۔"

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام ہی اصل اور سچا دین ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

ترجمہ:" آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔"

دین کے مکمل ہونے کا یہ وہ اعلان ہے جو دنیا کی کسی اور الہامی کتاب میں نہیں یہ پیام آخرین تھا جو نوع انسانی کو دیا گیا۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمت للعالمین

اسلام کے اصول واضح اور مکمل ہیں ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

"اور تیرے رب کی بات راستی اور انصاف میں پوری ہوئی۔ اس بات کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔"

اگر تمام دنیا کے مفکرین اور مصلحین اکٹھے ہو کر ایسا ضابطۂ حیات بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ اسلام انسان کے تمام معاشی و معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کی روشنی میں انسان کی سیرت ایک ایسے سانچے میں ڈھل سکتی ہے جس کا قرآن تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندگی فشاں قانون اور عالمگیر دستورِ حیات جو قصرِ انسانیت کو معاشرتی زلزلوں اور معاشی ناہمواریوں سے نجات دلاتا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ نظامِ حیات تمام نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہے گا۔ یہ نورِ عالم انسانیت کو منور کر کے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:-

ترجمہ:"وہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔"

اس نور سے قافلۂ آدمیت کے راہوں کی تاریکیاں چھٹ جاتی

ہیں۔ اسی جلوۂ خورشید سے کاروانِ انسانیت کے راستہ میں ادیانِ باطلہ کی پھیلائی ہوئی ظلمتیں دُور ہوتی ہیں۔ یہی وہ نور ہے جو انسانیت کو نسل و خون اور رنگ و وطن کے اغلال و سلاسل کی غلامی سے نجات دلا کر توحید پر انسانی برادری استوار کرتا ہے۔ جس میں حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ، وطن و نسل کے فرق کے باوجود ایک قوم بن جاتے ہیں۔ جبکہ ابولہب ابوجہل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم، ایک زبان اور ایک وطن رکھنے کے باوجود ایک قوم نہ بن سکے۔ ایسا ہونا ممکن ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفریق میں جدا جدا ہو جائیں اور دو بالکل اجنبی آدمی اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی بن جائیں۔ اسلام لا الٰہ الا اللہ کا باطل سوز نعرہ لگا کر انسان کو قومیت اور نسلیت کے تنگ دائروں سے نکال کر عالمیت کی فضاؤں میں لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام جہانوں کے لیے نبی بن کر آئے۔ جبکہ پہلے نبی اور رسول کسی خاص قوم اور بستی کے لیے آیا کرتے تھے۔ جب انسانی ذہن شعور کو پہنچا اور اس کی تمدنی زندگی کی وسعتوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا تو رسالت بھی قومی اور قبائلی ادوار سے نکل کر عالمگیر بن گئی۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو نمایاں کیا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام نوعِ انسانی کے لیے رسول اور قرآن قیامت تک دنیائے انسانیت کے لیے ہدایت اور قانونِ زندگی ہے۔ یہی وہ شمع فروزاں ہے جو ازل سے روشن ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس آفتابِ عالم کی شعاعیں پوری دنیا کے لیے محیط ہیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔

ترجمہ" اور ہم نے تجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ آپؐ ان طوق اور زنجیروں کو توڑ دیں جن میں نوعِ انسانی جکڑی چلی آ رہی ہے۔

قرآن نے ان تمام زنجیروں کو جو ہامانیت اور برہمنیت کی صورت میں جکڑے ہوئے تھیں ایک ایک کر کے کاٹ دیا۔ اسلام عالمگیر مساوات کا پیغام دیتا ہے اور آدمیت کا احترام سکھاتا ہے۔ اس سے رنگ و نسل اور زبان و وطن کے بت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

"تمام عالم اسلام ایک برادری ہے"۔

اسلام روحانی ترقی اور اُخروی نجات کا ضامن ہے۔ اس چشمۂ رُشد و ہدایت سے دلوں کی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں اور شجرِ انسانیت اس پاک اور منزّہ پانی سے سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ اسی آبِ حیات سے نخلِ انسانیت کی مرجھائی ہوئی شاخوں اور کملائے ہوئے پھولوں میں تر و تازگی آ جاتی ہے۔

اسلام ایک ایسا نور، ایک ایسا چراغ اور ایک ایسی روشنی ہے جس سے کاروانِ انسانیت کے قلوب منور ہوتے ہیں، ان کی زندگی کے راستے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے کلامِ پاک میں اسلام کو روشنی، نور، حق اور سچا دین کہا ہے جو ساری دنیا کے تمام مسلمانوں کی ضروریات کا ضامن اور خود کفیل ہے۔

تعارف و تبصرہ

احوال العارفین - تصنیف - حافظ غلام فرید صاحب

ملنے کا پتہ :- نذیر سنز پبلشرز - ۴۰ اے اردو بازار لاہور -

حضرت الامام السید مجدد الف ثانی قدس سرہ، دنیائے اسلام کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے شرق و غرب میں حضرت الشیخ کا احترام موجود ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کو جو رونق بخشی وہ بہت کم افراد کے حصہ میں آتی ہے - موصوف کے خلفاء میں ایک نام حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ کا آتا ہے جنہوں نے بعد میں مدینہ طیبہ زادہا اللہ شرفاً میں ہجرت کر لی اور وہیں بقیع غرقد میں آسودہ رحمت ہیں - سید بنوری قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے جو محبوبیت اور قبولیت نصیب فرمائی اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کی اولاد جسمانی و معنوی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ ان کے اخلاف میں اب تک علم و عرفان کا سلسلہ موجود ہے - حضرت السید آدم بنوری کے سلسلہ طریقت میں ایک بزرگ ہیں جنکا اسم گرامی تو عبد الغفور ہے لیکن وہ عام طور پر اخوند صاحب سواتی کے نام سے مشہور و معروف ہیں - حضرت اخوند صاحب اپنے دور کے عظیم المرتبت شیخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مجاہد اسلام بھی تھے - جنہوں نے برطانوی سامراج کے مقابلہ میں بڑی تکلیفیں برداشت کیں لیکن دینی فرض سمجھتے ہوئے انہوں نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا - موصوف کے خلفاء میں حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب سرساوی ثم سہارنپوری قدس سرہ کا اسم گرامی آتا ہے جو ابتداء میں فوج میں ملازم تھے لیکن حضرت اخوند صاحب کا حسن کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے توجہ دلانے سے فوج سے استعفیٰ دیکر فارغ ہو گئے اور پھر علم و معرفت کے ساتھ ساتھ جہاد حریت میں قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ،

رائے پور کی مشہور عالم خانقاہ سے ایک دنیا واقف ہے اس خانقاہ کے بانی حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری تھے جن کے خلیفہ ارشد حضرت الشاہ عبد القادر صاحب (ڈھڈیاں شریف ضلع سرگودھا) قدس سرہ تھے ، شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے سفر حجاز کے بعد جب آپ گرفتار ہو گئے حضرت رائے پوری ہی یہاں تمام تحریک کے نگران تھے ، آپ اور آپ کے خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کا مدارس اسلامیہ کی تعمیر و ترقی اور مجاہدین حریت سے جو ربط و ضبط تھا اور جس طرح آپ نے ایسے اداروں اور جماعتوں کی سرپرستی کی وہ خانقاہی نظام کا ایک زریں باب ہے ،،

حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمہ اللہ کا سلسلہ بیعت ابتداء میں حضرت شاہ عبد الرحیم سرساویؒ (سہارنپوری) سے تھا ، جنہوں نے آپ کو بڑے اعزاز و اکرام سے خلافت سے سرفراز فرمایا ان کے بعد روحانی مکاشفات اور حضرت الامام الامیر امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی توجہ سے قطب العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے رابطہ قائم کیا اور انہوں نے بھی آپ کو اپنے خلفاء میں امتیازی مقام بخشا ، گویا کہ حضرت رائے پوری (حضرت شاہ عبد الرحیمؒ) بیک وقت دو عظیم سلسلوں سے منسلک تھے اور ہر دو خانقاہوں سے آپ کو استفادہ کا خوب خوب موقع ملا

زیر تبصرہ کتاب حضرت شاہ عبد القادر صاحب قدس سرہ کے ایک فیض یافتہ حافظ غلام فرید صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ، جن کے پیش نظر صرف اپنے شیخ اور شیخ کی خانقاہ پاک سے متعلق اپنا شوق پورا کرنا تھا ،، لیکن بعض دوسرے اہل دل کے توجہ دلانے سے موصوف نے بانی خانقاہ رحیمی رائے پور کے شیخ الشیخ حضرت اخوند صاحب سواتی اور پورے سلسلہ کو قلم کی گرفت میں لے لیا تاکہ اس عظیم خانقاہی سلسلہ کی وہ خدمات جلیلہ عوام کے سامنے آ سکیں جو اب تک پردہ خفاء میں تھیں ،،

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے پہلے ملک کے نامور خطاط حضرت سید نفیس رقم صاحب مدظلہ کا مفصل دیباچہ ہے جس میں حضرت اخوند صاحبؒ کا بھرپور تعارف ہے ان کی خانقاہی خدمات ، مجاہدانہ سرگرمیاں ، امیر المومنین حضرت السید احمد شہید بریلوی قدس سرہ کی تحریک سے ان کے روابط جیسے اہم موضوعات کو نفیس صاحب قبلہ نے بڑی خوبصورتی سے مدلل طریق پر بیان کیا ہے اس کے بعد اصل کتاب کے باب اول میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ان کے خلیفہ حضرت آدم بنوریؒ اور اس سلسلہ مجددیہ ، قادریہ ، غفوریہ ، رحیمیہ ، کی پوری داستان ہے جو بانی خانقاہ رائے پور تک پہنچتی ہے ،

دوسرے باب میں حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خلیفہ اجل حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری کے ساتھ ساتھ دوسرے اعاظم خلفاء

مثلاً حضرت مولانا اللہ بخش بہاولنگری رح کا ذکر خیر ہے اور حضرت ثانی رائے پوری کے خدام و مستفیدین کا مبسوط تذکرہ ہے،

تیسرا باب حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوری قدس سرہٗ کے دوسرے خلیفہ مولانا محمد امیر باز خانصاحب سہارنپوری اور ان کے خلفاء و مستفیدین کے تذکرہ ..... اور آخری اور چوتھا باب حضرت اخوند صاحب سواتی کے ایک دوسرے خلیفہ مجاہد کبیر مولانا نجم الدین المعروف بڑے ملاں اور آپ کے خلفاء و اہل تعلق کے حالات پر مشتمل ہے۔

کتاب مجموعی طور پر ڈیڑھ صد سے زائد اہل اللہ کے حالات کا دلچسپ اور شیریں مرقع ہے، ان حالات کو اکٹھا کرنے کے لئے مرتب موصوف نے کسمپرسی کے عالم میں پشاور سے لیکر کراچی تک کے متعدد اسفار کئے اور صوبہ سرحد کے سنگلاخ علاقوں میں نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ ان کا جذبہ اور شوق رنگ لایا اور یہ خوبصورت کتاب معرض وجود میں آگئی، خانقاہ رحیمیہ رائے پور کے اکابر کے تذکرہ کے ساتھ حضرت اخوند صاحب سواتیؒ (بانی خانقاہ کے جد اعلیٰ) اور بڑے ملا اور مولانا محمد امیر باز سہارنپوری اور ان پورے سلسلہ کا بھرپور تعارف ملت کے سر پر قرض تھا جو موصوف نے محنت شاقہ سے چکا دیا۔ اس کتاب کے ذریعہ اہل حق کی کاوشوں، ان کی ریاضتوں اور ان کے جہاد فی سبیل اللہ کی جھلکیاں سامنے آئینگی، دور حاضر کے بے علم و بے عمل خانقاہ نشینوں (الا ماشاء اللہ) کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اسلاف کتنی عظمتوں کے مالک تھے اور اس دور پرفتن میں اکابر و اسلاف کی تاریخ کو مسخ کرنے کی جو شرمناک کوششیں ہو رہی ہیں ان کا احسن طریق سے سد باب ہو سکیگا،

حافظ غلام فرید صاحب صد ہزار مبارکوں کے مستحق ہیں کہ اس میدان کا آدمی نہ ہونے کے باوجود انہوں نے محنت شاقہ سے یہ گلدستہ مرتب کیا اور کتاب کے ناشر مالکان نذیر سنز پوری قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کساد بازاری کے اس دور میں یہ کتاب چھاپی — قارئین کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب کا زبردست خیر مقدم کر کے مرتب و ناشر کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ ایسی خوبصورت اور نادرۂ روزگار کتابیں کثرت کے ساتھ مارکیٹ میں آسکیں ،،ب،،

فقہائے ہند

(جلد پنجم حصہ اول) مصنف جناب محمد اسحاق صاحب بھٹی

ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور — قیمت ۲۴/۰ روپے

بھٹی صاحب موصوف کی اس کتاب کی ۴ جلدیں اس سے قبل مارکیٹ میں آچکی ہیں، پہلی جلد میں پہلی صدی ہجری سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک کے علماء و فقہاء کا ذکر تھا، دوسری جلد میں نویں صدی ہجری کے اور تیسری جلد میں دسویں صدی کے اہل علم و فقہ کا ذکر تھا، چوتھی جلد حصہ اول و دوم پر مشتمل تھی جسمیں گیارہویں صدی کے ائمہ علم کی داستان شیریں بیان کی گئی تھی — اب پانچویں جلد کا حصہ اول سامنے آیا ہے۔ جو بارہویں صدی ہجری کے اکابر علماء و فقہاء کا تذکرہ ہے چونکہ گیارہویں اور بارہویں صدی کا زمانہ علم کی اشاعت کے اعتبار سے بڑا ہی زرخیز اور پُر ثروت (بقول مصنف) دور ہے اسلئے چوتھی جلد کی طرح اس جلد کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی حصہ اول اور دوم زیر تبصرہ حصہ اول حروف تہجی کے اعتبار سے الف سے ک تک ۱۶۲ علماء فقہاء کا زندہ جاوید تذکرہ ہے،

فاضل مصنف نے ہر حصہ کا مقدمہ الگ سے لکھا ہے، جسمیں اس صدی کے حکمرانوں کے حالات زندگی ان کے علماء سے تعلقات اور علم پروری کا ذکر کیا گیا ہے یہ حصہ چونکہ دودمان مغلیہ کے چھٹے بادشاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ کے علماء کے حالات پر مشتمل ہے اسلئے موصوف نے غازی موصوف کا تذکرہ بڑی تحقیق و جستجو کے ساتھ لکھا ہے،

غازی اورنگ زیب مرحوم کی علم دوستی، علم پروری، علماء و فقہا اور فقراء سے تعلق کا ایک زمانہ معترف ہے ۵۱ سال تک بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنے والے اس عظیم بادشاہ نے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے حیات کے علم و معارف پروری میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے مقدمہ میں اسکا تفصیلی ذکر ہے، اور پہلی جلدوں کی مانند یہاں بھی فاضل مصنف نے بادشاہ وقت کی سچی تصویر پیش کی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بادشاہ جنہیں دشمنوں کے ساتھ ساتھ "دوستوں" نے بھی بدنام کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی کتنے خدا ترس اور علم دولت تھے"

اس تحقیقی کاوش پر فاضل مصنف اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ارباب حل و عقد مستحق تبریک ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ علم دوست حضرات اس تحقیقی کتاب کی قدر کرینگے تاکہ فاضل مصنف بہ حسن و خوبی اس کام کو انجام تک پہنچا سکیں —